وائی کنگز کے دیس میں
(سفرنامہ)
منزہ نصیر

وائے کنگ
کے
دیس میں
(سفرنامہ)
مصنفہ
منزہ نصیر
سرورق اور فوٹوگرافی
مریم عماد
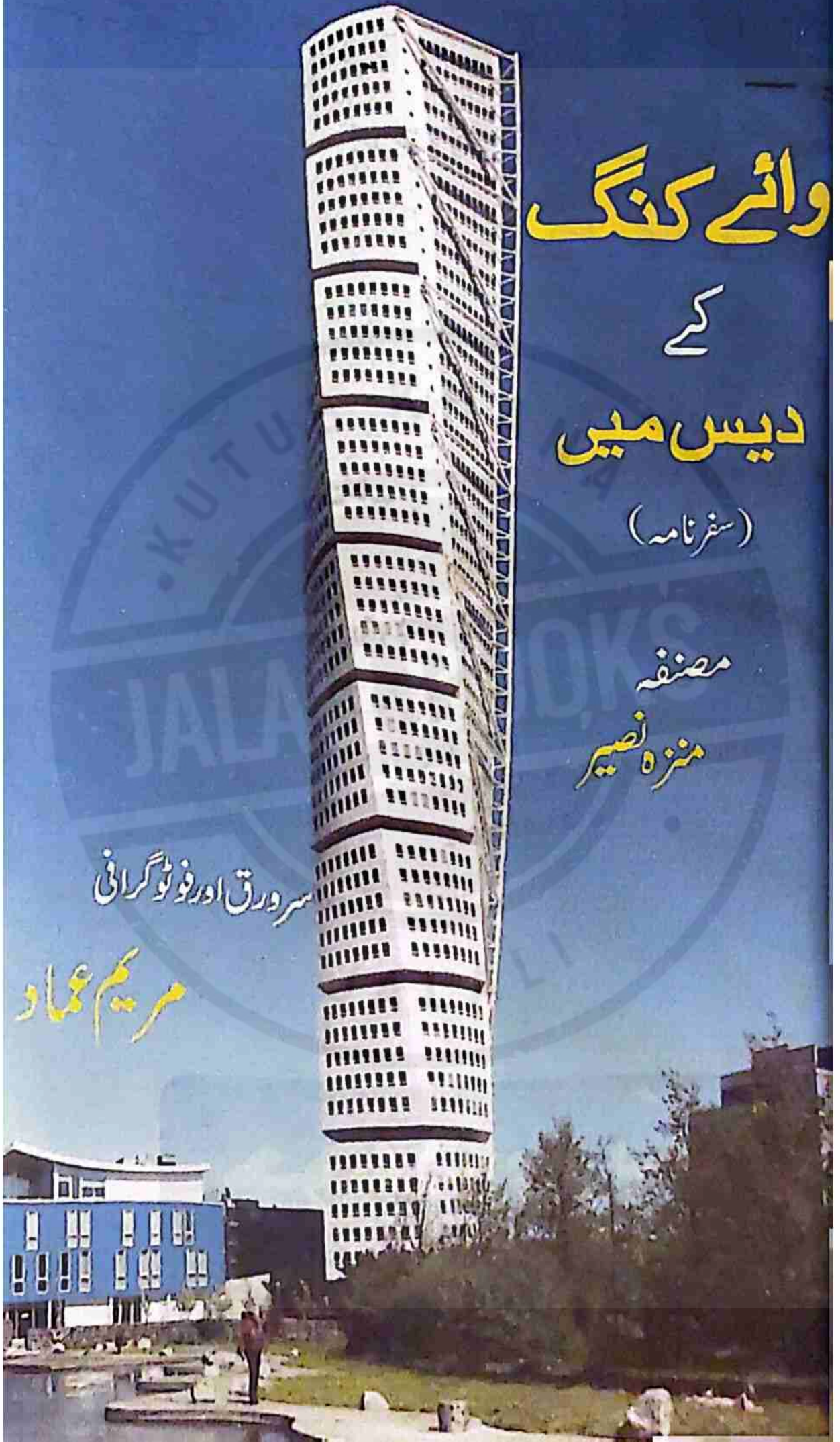
نام کتاب : وائی کنگ کے دیس میں (سفرنا...

مصنفہ : منزہ نصیر موبائل 0300-8433756

منتظم اشاعت : چوہدری نصیر احمد

سال اشاعت : 2019

کمپوزنگ + فارمیٹنگ : محمد عقیل عمر 0300-8141019

قیمت : -/400

سرورق اور فوٹو گرافی : مریم عماد

پرنٹرز

المقبول پرنٹرز

0323-5986232

چوہدری بکس

H-51 سکھ چین گارڈن نزد بحریہ ٹاؤن لاہور

0300-8433756

انتساب

اُن کے نام

جو پھولوں، تتلیوں اور رنگوں کے
بلاوے پر مجھ سے ہاتھ چھڑوا کر
ہجومِ رنگ میں خوشبو کی صورت مل گئے ہیں۔

فہرست

☆

مئی 2016ء کے ''حکایت'' کے شمارے میں ''وائی کنگز کے دیس میں'' کی پہلی قسط شائع ہوئی تو میں نے عارف محمود، ایڈیٹر انچیف ماہنامہ ''حکایت'' سے فون پر پوچھا۔

''عارف صاحب! قلم و قرطاس کی یہ چھپی رستمہ، منزہ نصیر، کہاں سے ڈھونڈ نکالی ہے؟''

''میاں صاحب! یہ تو آپ کے ہمسائے میں ہی کہیں چھپی بیٹھی تھیں۔ نصیر احمد چوہدری صاحب کی اہلیہ محترمہ ہیں''۔

میں چونکا...... نصیر چوہدری صاحب سے تو روزانہ ہی نمازِ فجر کے بعد ملاقات ہوتی تھی اور ہوتی ہے۔ انہوں نے تو کبھی اپنی اہلیہ محترمہ کی قلم و قرطاس سے وابستگی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید ان کی نظر میں گھر کی مرغی دال برابر ہوگی۔ ہم چند دوست، چوہدری نصیر احمد سمیت، اکٹھے صبح کی سیر اور ہوا خوری کے لئے نکلتے تھے۔ ملکی حالات، سیاسی تکدر اور حکمرانوں کے کرتوتوں پر تبصرے اور تبرے، اس آدھے گھنٹے کی سیر کے دوران سب کچھ ہی چلتا تھا اور اپنے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے جاتے تھے اور چوہدری نصیر احمد بعض اوقات جذباتی بھی ہو جاتے تھے، لیکن ان کی اہلیہ محترمہ منزہ نصیر کی تحریر میں پُرسکون ندی کی سی روانگی، بے ساختگی اور شہد کی سی چاشنی جھلکتی نظر آتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں وہ طنز و مزاح کا تڑکا بھی خوب لگاتی ہیں کہ پڑھتے ہوئے بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔

پورا سفرنامہ پڑھنے کے بعد میں نے نصیر احمد چوہدری صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ اسے کتابی شکل میں آنا چاہئے۔

دو سال کی طویل خاموشی یا غور و فکر کے بعد وہ میری تجویز پر عمل کرنے پر آمادہ

ہو ہی گئے ہیں۔ ست بسم اللہ!

اِس کتاب کی اشاعت کے بعد انشاء اللہ، محترمہ منزہ نصیر کا شمار بھی موجودہ دور کی نامور سفرنامہ نگار خواتین، محترمہ سلمیٰ اعوان، کوکب خواجہ، بلقیس ریاض وغیرہم کی صف میں ہونے لگے گا۔

اِس سفرنامہ کے علاوہ مجھے منزہ نصیر صاحبہ کی کوئی اور تحریر پڑھنے کا موقع نہیں ہے۔ نصیر صاحب کی زبانی علم ہوا تھا کہ محترمہ ''اردو ڈائجسٹ'' میں بھی طبع آزمائی کرتی رہی ہیں۔ مری دلی دُعا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

محمد ابراہیم طاہر
19 اگست 2018ء

☆

اپنا تعارف کروانا تو خلیل جبران جیسے فلسفی کے لئے بھی شاید دُنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ جبھی تو اُس نے کہا تھا۔

''میں کبھی لاجواب نہ ہوا، مگر اُس کے سامنے جس نے پوچھا، تو کون ہے؟''

ایسے میں مجھ ایسی گھر کا ہانڈی چولہا کرنے والی عورت کی بھلا کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

میرے محترم بزرگ میاں ابراہیم طاہر صاحب نے جو کچھ میرے بارے میں فرمایا، وہ اُن کی محبت تو ہوسکتی ہے، میرا استحقاق ہرگز نہیں۔ خاص طور پر اُنہوں نے مجھے جن محترم خواتین کے برابر کھڑا کردیا وہ میری انسپائریشن ہیں۔ میں نے اُن کو پڑھ کر لکھنا سیکھا ہے۔ میں اُن کے برابر کھڑے ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ سفرنامہ لکھنے کا پہلا موقع ہے۔ قارئین کی رائے کی منتظر رہوں گی۔

منزہ نصیر

یکم اکتوبر 2018ء
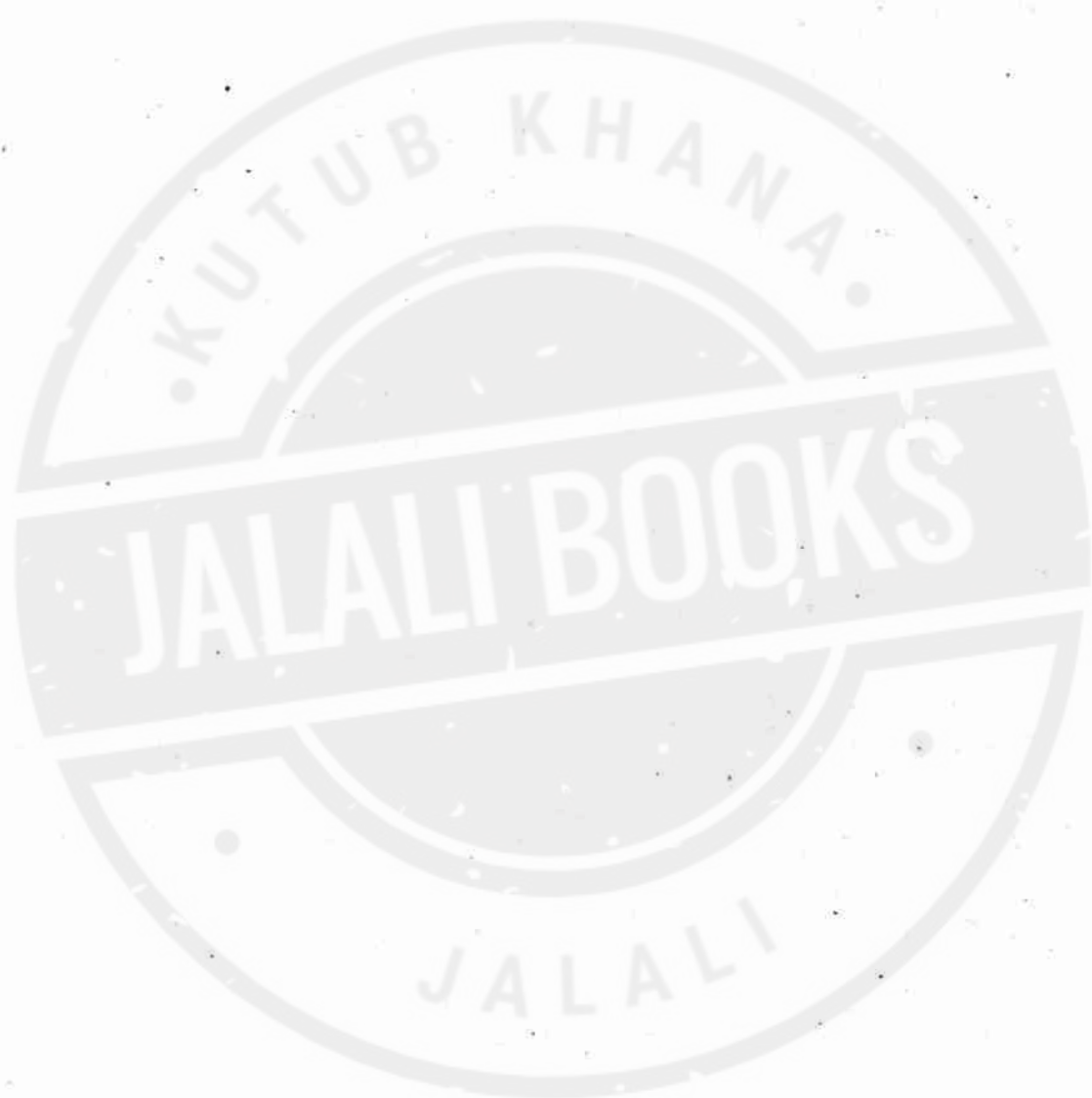
اللہ ہی کے لئے ہیں تمام تعریفیں، جو ان ہوائی سواریوں کو ہمارے لئے مسخر کرتا ہے۔ مہینوں اور سالوں کا سفر چند گھنٹوں تک محدود کر دیتا ہے۔ بے شک ہم اس کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

ہوا پھر سے حکم صادر

جانا ٹھہر گیا تھا۔

سفر کہیں کا بھی ہو اذنِ خداوندی کے بغیر ممکن نہیں۔ جب وہ ہمارا رزق کہیں اور لکھ دیتا ہے، جب ہمارے سانسوں کی ہوا کسی اجنبی سرزمین سے ہمیں پکارتی ہے تو جانا ہی ہوتا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں...... بے نیاز رب کے سامنے نیازمند بندے کی چاہت بھلا کیا حیثیت رکھتی ہے۔

ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے میاں جی نے فرمادیا۔ ''مسز آپ سویڈن سے ہو آئیں'' یوں جیسے سویڈن 4000 میل دور نہ ہو، بلکہ پڑوس میں ہو اور یوں جیسے سویڈن جانا پھپھو کی ملیاں جانے کی بات ہو۔

''لیکن میں کیسے جاسکتی ہوں؟'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

''کیوں نہیں جاسکتیں۔ کیا آپ کا ویزہ نہیں لگا ہوا؟''

''آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیوں نہیں جاسکتی''۔ میں نے کہا۔ ''یہ بات تو

پہلے سے طے تھی کہ اگر صغریٰ کا ویزہ نہ لگا تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔ اب آپ بتائیں ذہنی پسماندہ جوان بچی کو چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں؟"

"یار! تم عورتیں معلوم نہیں خود کو وہ گائے کیوں تصور کرنے لگتی ہو جس نے دنیا کو سینگ پر اٹھا رکھا ہے۔ آپ تیاری کریں اور جائیں۔ آپ کے سینگ بدلنے سے کوئی زلزلہ نہیں آنے والا۔ اتنی چاہت سے بیٹا بہو بلا رہے ہیں۔ کتنی خواہش ہے ان کی کہ ماما کچھ عرصہ ان کے گھر گزاریں۔ کیا عماد ہمارا بیٹا نہیں ہے۔ اس کی خواہش کا احترام کرنا ہم پر لازم نہیں آتا؟"

"جی! بالکل لازم آتا ہے، مگر صاحبزادی جو ہنگامہ مچائے گی اس کا کیا سوچا آپ نے؟"

"کوئی ہنگامہ نہیں مچائے گی، ابھی دیکھو"۔ انہوں نے صغریٰ کو مخاطب کیا۔ "ماما سویڈن جا رہی ہیں صغریٰ! آپ کے لئے کیا گفٹ لے کر آئیں؟"

"چاکلیٹ، جیکٹ، پکچر بک، کلرز، سٹیکرز اور سمبا۔ اتنا بڑا"۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر سمبا کا سائز بتایا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

"کھا ہی نہ جائے تجھے سمبا اتنا بڑا"۔ میں نے جل کر کہا۔ "اگر میرے بعد بابا کو بھائی کو بھابی کو تنگ کیا تو؟"

"نہیں کروں گی"۔ وہ زور زور سے سر اور ہاتھ ہلانے لگی۔

"بس آپ جا رہی ہیں"۔ شوہر نامدار صاحب کا انداز قطعی تھا۔ میرے اگر مگر لیکن چونکہ چنانچہ کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ حکمِ خداوندی خدائے مجازی کی زبان سے ادا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ایک عزیز کو فون کر رہے تھے جو ایئر ٹکٹنگ کے کاروبار سے

وابستہ ہیں۔

"یار! ایک ریٹرن ٹکٹ چاہیے پی آئی اے کا...... لاہور کوپن ہیگن لاہور۔ چار دن بعد بدھ 23 جولائی کو جو فلائٹ جارہی ہے اسی کا...... اچھا ٹھیک ہے میں تمہیں نام اور پاسپورٹ نمبر sms کرتا ہوں"۔ پندرہ منٹ میں جوابی ایس ایم ایس آ گیا۔

"ٹکٹ ای میل کر دیا گیا ہے"۔

23 جولائی کی صبح دس بجے پی آئی اے کی فلائٹ PK-751 سے روانہ ہونا تھا۔ میرے پاس صرف چار دن تھے۔ اس سے پہلے صغریٰ کا ویزہ نہ ملنے کی وجہ سے پروگرام کینسل ہو چکا تھا، لہٰذا کوئی تیاری نہ تھی۔ اب لشتم پشتم تیاری کی جارہی تھی۔ دل بجھا ہوا تھا اور دماغ میں اندیشے کے جرثومے کلبلاتے تھے۔ سب گھر والوں کا کہنا تھا کہ میں اطمینان سے جاؤں اور تمام اندیشے اور وسوسے ذہن سے جھٹک دوں، لیکن یہ سب اتنا آسان کہاں تھا۔

گھر کے بارے میں مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ شوہر نامدار صاحب نے یہ کہہ کر کہ آپ ہی وہ گائے نہیں جس نے دنیا کو سینگ پر اٹھا رکھا ہے، میری خوش فہمی کے غبارے میں سوئی چبھو دی تھی۔ مگر صغریٰ کے خیال سے میں چاہتے ہوئے بھی دامن بچا نہ پائی تھی۔ 25 سالہ ذہنی پس ماندہ بچی جس کی ذہنی عمر بمشکل پانچ سال ہے، مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرتی تھی۔ ادھر سویڈن میں میرا بیٹا عماد، بہو مریم اور ان کے دو پیارے بچے سات سالہ طٰہٰ اور تین سالہ رجاء بے حد پُر جوش تھے اور اماں کے منتظر۔

"ماما! اس دفعہ آپ عید ہمارے ساتھ منائیں گی اور یہ ہماری اب تک کی بہترین عید ہوگی"۔ وہ خوشی سے کہتے اور میں ایک پل کو اپنے وسوسے اور پریشانیاں بھول جاتی۔

شاید، نہیں یقیناً ہر ماں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے، جہاں جہاں اس کے وجود کے حصے یعنی اس کے بچے رہتے ہیں وہاں وہاں اس کی شخصیت کے حصے بکھرے رہتے ہیں۔ اس ساری ضرب تقسیم میں وہ خود کہاں ہوتی ہے......شاید کہیں بھی نہیں۔

جہاز میں زنانہ ڈبہ

23 جولائی صبح ساڑھے آٹھ بجے ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ اپنی بہو آمنہ اس کے پیارے بیٹے دائم اور ننھی منی گڑیا دیریم کو گھر سے ہی خدا حافظ کہہ دیا۔ میرا بیٹا سلمان، شوہر نصیر صاحب اور صغریٰ میرے ساتھ ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہے تھے۔ صغریٰ کو الوداع کہتے ہوئے میں دعا کر رہی تھی کہ وہ کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔ اللہ کا شکر کہ اس نے مجھے بخوشی رخصت کیا اور اپنے تحائف کی یاددہانی کرانا نہ بھولی۔

امیگریشن کے مراحل سے فارغ ہو کر بورڈنگ پاس اور پاسپورٹ ہاتھ میں تھامے لاؤنج میں آبراجمان ہوئی۔ لاؤنج میں موجود مسافروں کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا کہ جہاز تقریباً دوتہائی خالی جائے گا۔ رمضان کے آخری دن چل رہے تھے۔ ان دنوں کم ہی لوگ سفر کرتے ہیں، مگر بھلا ہو ٹریول ایجنٹس کا۔ جب ٹکٹ چاہئے ہو تو (Peack Season) بتاتے ہیں۔ شکر ہے میرا ان سے واسطہ نہ پڑا تھا۔

ابھی فلائٹ میں وقت باقی تھا۔ 9 گھنٹے طویل سفر کا خیا ہی وحشت زدہ کر دینے والا تھا۔ میں بک شاپ میں جا کر کتابیں دیکھنے لگی۔ عبداللہ حسین کا ناول ''باگھ'' خرید کر بیگ میں رکھ لیا۔

لاؤنج کے شیشوں کے پار جہاز ایک دیوہیکل پرندے کی طرح دکھائی دیتا تھا جو کچھ دیر بعد ہم سب کو اپنے پیٹ میں سمو کر پرواز کر جانے والا تھا۔ سمندروں کے اس

پار...... ایک نئے براعظم کی طرف...... میری منزل سویڈن کا شہر مالمو تھی جو ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن سے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ سو مالمو سے جانے والے کوپن ہیگن ایئرپورٹ ہی استعمال کرتے ہیں۔

لاہور سے سات گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز نے اوسلو لینڈ کرنا تھا، جہاں اوسلو کے مسافر اترتے ہیں اور لاہور کے لئے مسافر سوار ہوتے ہیں۔ پھر ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر لینڈنگ ہوتی ہے۔ کوپن ہیگن کے مسافر اترتے ہیں اور لاہور کے لئے مسافر سوار ہوتے ہیں۔ جہاز واپس لاہور آجاتا ہے۔ گویا یہ پرواز یوں ہے ''لاہور اوسلو کوپن ہیگن لاہور'' جہاز کے جس حصے میں مجھے سیٹ ملی تھی وہ دو تہائی سے زیادہ خالی تھا۔ ایک آدھ مرد کے علاوہ باقی مسافر خواتین ہی تھیں۔ مجھے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ ملی تھی۔ میرے ساتھ والی دونوں سیٹیں خالی تھیں۔ درمیان والی تین سیٹوں پر ایک صاحب تھے۔ دوسری طرف کھڑکی والی سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی تھی جو جہاز چلنے تک موبائل فون پر کسی سے محوِ گفتگو رہی اور آنسو پونچھتی رہی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ نئی شادی شدہ تھی اور پہلی بار سسرال جا رہی تھی۔ خود میرا دل بے حد بوجھل تھا بار بار صغریٰ کا سوچتی تھی کہ اگر اس کا ویزہ بھی مل جاتا تو میرے ساتھ ہمسفر ہوتی۔ بھابی اور بھائی سے مل کر کتنی خوش ہوتی۔

ہوائی سفر کے آغاز میں جب جہاز اڑان بھرتا ہے، میرے اعصاب تن جاتے ہیں۔ یہ تناؤ اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک جہاز مقررہ بلندی تک پہنچ جائے اور پرواز ہموار ہو جائے۔ میں نے سیٹ بیلٹ کا آہنی کنڈا کھول کر گہرے سانس لئے اور اعصاب کو پُرسکون کیا۔ بیگ سے ناول نکال کر خود کو اس میں گم کر دیا۔

ایک گھنٹہ مطالعہ کرنے کے بعد ناول بند کر دیا۔ ابھی اوسلو تک چھ گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ میرے سامنے لگی ہوئی چھوٹی سی سکرین جو جہاز کی لوکیشن بلندی اور سپیڈ وغیرہ بتاتی تھی، بالکل تاریک تھی۔ میں نے ایئر ہوسٹس کی توجہ دلائی تو ''اوکے میم ابھی ٹھیک کراتی ہوں'' کہہ کر ایسی غائب ہوئی کہ اوسلو تک خود بھی دکھائی نہ دی۔

اکلوتا مرد مسافر غالباً زنانہ ڈبے میں خود کو عجیب محسوس کرتے ہوئے کہیں اور جا چکا تھا۔ خواتین وقت گزاری کو چہل قدمی کر رہی تھیں۔ میرے پاس سے گزرتی ہوئی ایک خاتون مجھے دیکھ کر مسکرائیں تو میں نے ان کو اپنے پاس بیٹھنے کی پیشکش کر دی۔ تعارف کا مرحلہ طے ہوا۔ وہ 42 سال سے ناروے میں مقیم تھیں۔ منڈی بہاؤالدین کے کسی گاؤں سے تعلق رکھتی تھیں۔ آٹھ سال بعد بہن کی وفات پر پاکستان آئی تھیں اور دو ماہ رہ کر واپس جا رہی تھیں۔ شادی شدہ بچے اپنی زندگیوں میں خوش تھے اور ناروے کے مستقل شہری تھے۔ سیدھی سادی ناخواندہ خاتون پاکستان کے حالات پر بے حد آزردہ تھیں۔

''کیا بتاؤں بہن! آٹھ سال پہلے اتنے بُرے حالات نہ تھے، اب تو اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ مہنگائی کے ہاتھوں پریشان نظر آتے ہیں۔ نہ بجلی ہے نہ گیس، نہ پانی، کسی کی جان محفوظ ہے نہ مال نہ آبرو...... دن دیہاڑے خواتین کی عزت لوٹ لی جاتی ہے اور بہن میرا تو مر جانے کو جی چاہا، جب میں نے ٹی وی پر دیکھا کہ لٹنے والی بچی منہ پر چادر لپیٹے بیٹھی تھی، وزیر اعلیٰ اس کو تسلی دے رہے تھے اور اس کے باپ بھائیوں سے ہمدردی کر رہے تھے۔ ارے میں کہتی ہوں لعنت ہے ایسی ہمدردی پر جو بات پہلے گاؤں والوں کو معلوم تھی، وزیر اعلیٰ کے دورے کی وجہ سے سارے ملک کو پتہ لگ گئی۔ مجرم کھلے پھر رہے ہیں۔ ان کو وزیر اعلیٰ کی ہدایت کے باوجود پکڑا نہیں جاتا اور اگر پکڑے جائیں تو جلد ہی ضمانتیں کرا کے

آجاتے ہیں''۔

وہ بے تکان بولتی چلی گئیں۔ بیالیس سال ناروے جیسے بے باک معاشرے میں گزارنے کے باوجود ان میں پنج دریاؤں کی دھرتی سے تعلق رکھنے والی غیرت مند عورت زندہ تھی۔

''آپ ہمیشہ آٹھ نو سال میں ہی پاکستان کا چکر لگاتی ہیں؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''شروع میں جب ماں باپ اور ساس سسر زندہ تھے تو سال دو سال بعد آجاتے تھے، ہم پاکستان۔ اب کون بیٹھا ہے، ہمیں یاد کرنے کو، بچے ناروے میں پیدا ہوئے، مسلمان خاندانوں میں شادیاں کیں، ادھر ہی کاروبار کر رہے ہیں۔ شوہر وہیں کی خاک اوڑھ کر سو گئے۔ دو گز زمین مجھے بھی مل ہی جائے گی''۔

''آپ کے بھائی بہن اور دیگر رشتے دار؟''

''جن لوگوں کو ہم اپنے وجود کی بجائے تحائف اور پیسوں کا عادی بنا دیتے ہیں ان کو بھی ہمارا وجود بوجھ لگتا ہے۔ وہ ہمارے بجائے تحفوں کے منتظر رہتے ہیں''۔ گو کہ ناخواندہ تھیں مگر زندگی کو برتا تھا۔ جبھی تو اچھا خاصا فلسفہ بول گئی تھیں۔

جہاز کا عملہ چائے سرو کر رہا تھا، مجھے اس ٹھنڈی بدرنگ اور بدمزہ چائے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سو منع کر دیا۔

''آپ کوپن ہیگن جا رہی ہیں؟'' ایک اور خاتون ہماری گفتگو میں شامل ہو گئیں۔

''جی نہیں، مجھے مالمو جانا ہے''۔

''آپ مالمو میں رہتی ہیں؟''

''نہیں میں اپنے بیٹے کے گھر جا رہی ہوں، مستقل رہائش پاکستان میں ہے''۔

ہماری ہم سفر نوجوان لڑکی بھی ہمارے پاس چلی آئی۔ غالباً اس نے بور ہونے پر آنٹیوں کی رفاقت کو ترجیح دی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ نئی شادی شدہ تھی۔ اس کو لنڈ (Lund) جانا تھا جو مالمو سے اگلا شہر ہے اور کوپن ہیگن سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔

''میں بہت تشویش کا شکار ہوں آنٹی! پہلی بار اپنے گھر والوں سے اتنی دُور آئی ہوں۔ نئے ماحول اور نئے لوگوں میں پتہ نہیں کیسے ایڈجسٹ کر پاؤں گی خود کو؟''

''تم خوش قسمت ہو بچی! جو اس موسم میں یورپ جا رہی ہو''۔ منڈی بہاؤالدین والی گویا ہوئیں۔ ''آج سے 42 سال پہلے جب میں ناروے آئی تھی تو جنوری کا مہینہ تھا۔ ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی اور ماحول پر بادلوں کی وجہ سے تاریکی چھائی رہتی تھی۔ کب صبح ہوئی، کب دن ڈھلا کچھ خبر نہ ہو پاتی تھی۔ گھر والوں سے واحد رابطہ خط و کتابت تھا۔ خط کا جواب آنے میں پندرہ بیس دن لگ جاتے تھے۔ اب تو سکائپ وغیرہ نے فاصلے ہی سمیٹ دیئے ہیں''۔

سفر کی طوالت نے سب کو آپس میں بے تکلف کر دیا تھا۔ اپنے اپنے موبائل فون پر فیملی اور بچوں کی تصویریں ایک دوسرے کو دکھائی جا رہی تھیں۔ خاندانی مسائل زیرِ بحث تھے۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ گھر سے نکلو تو ہر چہرہ ایک کہانی ہے۔ بس ہلکے سے پھرول دو پھر دیکھو کیا کچھ نکلتا ہے اور اگر آپ کہانی کار ہو تو کہانی ضدی بچے کی طرح پلو پکڑے ساتھ ساتھ پھرتی ہے کہ مجھے لکھو...... مجھے لکھو۔

جہاز اوسلو لینڈ کرنے کے لئے بلندی کم کرنے لگا۔ ہم سب نے اپنی سیٹوں پر

جا کر سیٹ بیلٹس باندھ لیں۔ میں نے اپنا ناول نکال کر مطالعہ شروع کر دیا۔ طیارے کے پہیوں نے زمین کو چھوا اور ٹیکسی کرتا ہوا ایئر پورٹ کی عمارت کے سامنے رُک گیا۔ ہماری ایک ہمسفر کی منزل آ گئی تھی۔ انہوں نے دستی سامان سمیٹا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئیں۔ جہاز میں صفائی کی جا رہی تھی۔ ویکیوم کلینر چلاتی ہوئی موٹی سی نارویجین عورت میرے قریب سے گزر گئی۔

''سفید چمڑی والی جمعدارنی''۔ میں نے کمینی سی خوشی محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ سفید فام قوموں کے سامنے ہم نسل در نسل احساسِ کمتری کے مارے لوگ ایسی ہی گھٹیا باتیں سوچ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ صفائی کے بعد لاہور کے مسافر جہاز پر سوار ہونا شروع ہو گئے، لیکن ان کی تعداد بھی کم تھی۔ چند دن بعد عید الفطر جو آنے والی تھی۔ عملے کے ایک صاحب میرے قریب آ کر پوچھنے لگے، آپ کو کوپن ہیگن جانا ہے؟

''جی، یقیناً!'' (کمال ہے اتنے بڑے جہاز میں ایک میں ہی ان کو غافلہ خانم نظر آتی ہوں) میں نے بدمزگی سے سوچا۔ ان کو غالباً اپنے سوال کے احمقانہ پن کا اندازہ ہو گیا تھا۔

''جی وہ......آپ کتاب پڑھ رہی تھیں تو میں سمجھا کہ آپ......'' وہ کھسیا کر واپس پلٹ گئے، اپنی سمجھداری سمیت۔

جہاز کوپن ہیگن کی طرف محوِ پرواز تھا۔ بس تھوڑی دیر اور، میں نے خوشی سے سوچا۔ ایک طویل سفر کا اختتام ہوا چاہتا ہے۔ اللہ ہی کے لئے ہیں تمام تعریفیں جو ان ہوائی سواریوں کو ہمارے لئے مسخر کرتا ہے۔ مہینوں اور سالوں کا سفر چند گھنٹوں تک محدود کر دیتا ہے۔ بے شک ہم اس کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ میں بچوں کے بارے

میں سوچنے لگی۔ مریم آفس سے آچکی ہوگی۔ طٰہٰ اور رجاء کی گرمیوں کی چھٹیاں چل رہی ہیں۔ ان کی وجہ سے عماد نے بھی دفتر سے چھٹیاں لے رکھی ہیں۔ وہ لوگ ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہونے والے ہوں گے۔ کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر امیگریشن افسر نے میرے پاسپورٹ پر سرسری نظر ڈالی، مشین پر سکین کیا اور ٹھپہ لگا کر میرے حوالے کر دیا۔ میں جو یورپی اور امریکی ایئرپورٹس پر پاکستانیوں کی تذلیل کی بے شمار حکایات سن چکی تھی، ایک حیرت آمیز خوشی سے دوچار ہوگئی۔

تمام مسافر اپنا دستی سامان اُٹھائے طویل راہداریوں سے گزرتے ہوئے اس ہال کی طرف رواں دواں تھے، جہاں کنویئر بیلٹ سے سامان حاصل کرنا تھا۔ 75,70 سالہ ایک خاتون بھاری بیگ کو کبھی اٹھاتی، کبھی گھسیٹتی ہانپتی جاتی تھیں۔ میرے پاس دستی سامان میں صرف ایک چھوٹا ہینڈ بیگ تھا، دل میں آیا کہ ان کی مدد کر دوں۔

اوں ہوں...... کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ میرے اندر کی بداعتمادی کی حد کو پہنچی ہوئی محتاط عورت نے تنبیہ کی۔ میں نے ان کی مدد تو نہ کی البتہ مفت مشورے سے نواز دیا۔

''آپ کو اتنا بڑا بیگ ساتھ نہیں رکھنا چاہئے تھا''۔

''ہاہ ہ! میں کہاں رکھتی ہوں...... ہاہ...... یہ تو صبح ہاہ ہ...... گھر سے نکلتے وقت میرے بیٹے کی ساس۔ ہاہ ہ...... سوغاتوں سے بھرا بیگ دے گئیں۔ ہاہ...... ہاہ...... اپنے نواسوں نواسیوں کے لئے ہاہ......''

''لائیں مجھے دیجئے''۔ مجھ سے آخر کار نہ رہا گیا۔ انہوں نے لمحے کا توقف کئے بغیر دس بارہ کلو وزنی بیگ مجھے تھما دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے یہ بوجھ پانچ منٹ سے زیادہ نہ

اٹھانا پڑا، کیونکہ ہم اس ہال میں پہنچ گئے تھے جہاں کنویئر بیلٹس پر سامان آ رہا تھا۔ میں نے بیگ ایک ٹرالی پر رکھ کر ٹرالی بڑی بی کو تھما دی اور خود اپنی ٹرالی لے کر اس بیلٹ کی طرف بڑھ گئی جس کے اُوپر PK-751 کے ہندسے روشن ہو چکے تھے۔

شام کو عماد کو کندھا دبواتے ہوئے یہ ماجرا سنایا تو محبت بھری ناراضگی سے بولا۔ ''یہ لیڈی ٹارزن نہ بنا کریں، آپ کسی دن کندھے یا گھٹنے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ اگر وہ بوڑھی تھیں تو آپ کے بھی سپیئر پارٹس نہیں ملتے اب''۔

سامان لے کر باہر نکلتے ہی خوشی سے لبریز آواز کانوں میں پڑی۔ ''ماما!'' اور وہ چاروں بھاگتے ہوئے آ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ عماد، مریم، طٰہٰ اور رجاء...... میں ان کو گلے لگاتی تھی اور ایک سکون آمیز ٹھنڈک میرے وجود میں لہریں لیتی تھی۔

تین زبانیں بولنے والی گڑیا

ہماری گاڑی کوپن ہیگن کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی مالمو کی طرف رواں تھی۔ ایک طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد میں صرف اپنے بچوں کو سننا اور محسوس کرنا چاہتی تھی۔ فی الحال باہر کے مناظر میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر جب گاڑی ایک سرنگ میں داخل ہوئی تو باہر کے ماحول نے میری توجہ کھینچ لی۔ سرنگ کے دونوں طرف لگی برقی روشنیاں اندھیرے کا قلع قمع کر رہی تھیں۔

''ماما! یہ سرنگ سمندر کے نیچے سے گزرتی ہے''۔ عماد نے مطلع کیا۔ ''کوپن ہیگن اور مالمو کو ملانے والا اوری سنڈ برج تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک مصنوعی جزیرہ (Peberholm) جس پر سے ہم ابھی گزر کر آئے ہیں۔ پھر یہ ساڑھے تین کلومیٹر لمبی سرنگ اور اس کے بعد پل آئے گا جو تقریباً آٹھ کلومیٹر ہے۔ یہ یورپ کا سب سے طویل
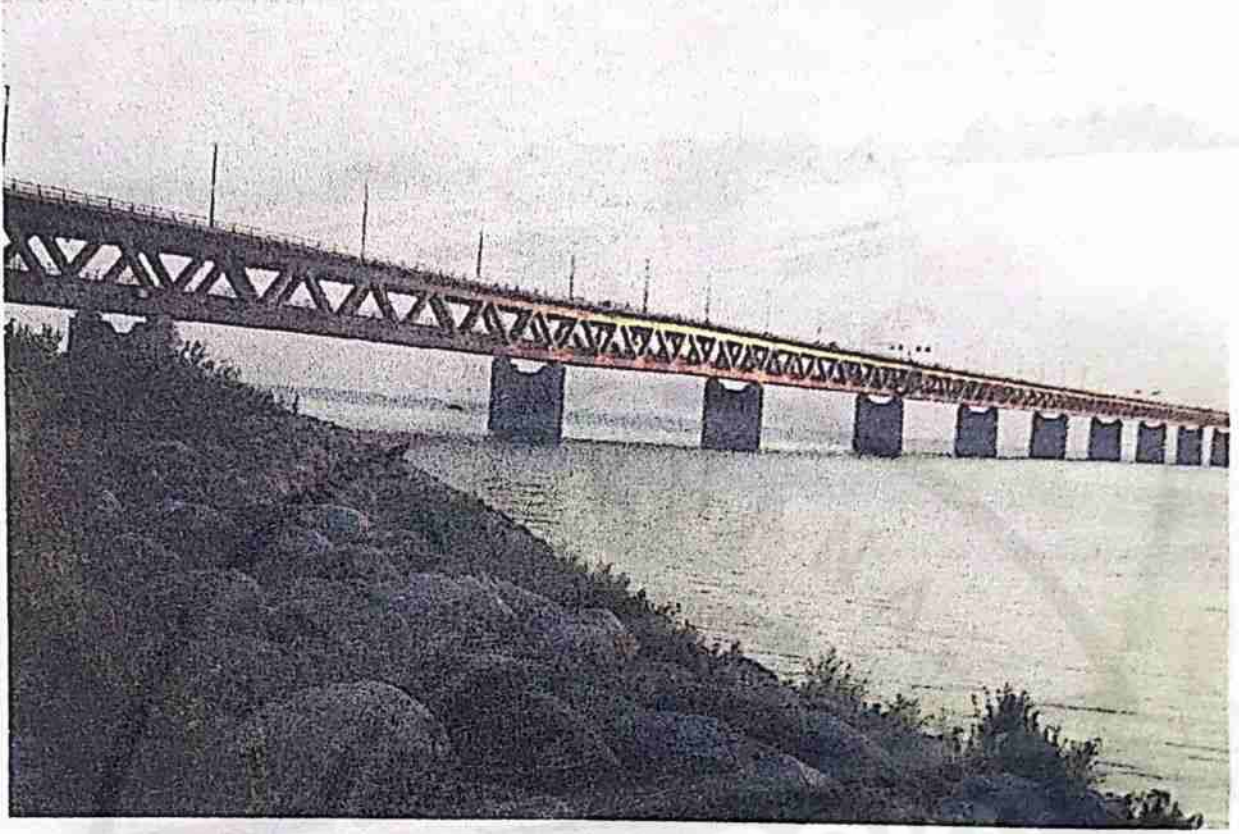
ڈوبتے سورج کی کرنوں میں اوریسند کا پل سنہری ہو گیا ہے

توڑی کے گٹھے

جدید آلات کی مدد سے گندم کی کٹائی چھڑائی (۱)

جدید آلات کی مدد سے گندم کی کٹائی چھڑائی (۱)

2 منزلہ پل ہے جو ریل اور سڑک دونوں پر مشتمل ہے"۔

"لیکن اس کا کچھ حصہ سرنگ اور جزیرے پر کیوں مشتمل ہے؟"

"ماما جانی! جہاز اترنے کے لئے بلندی کم کرتے ہیں تو پل کی اونچائی رکاوٹ بن سکتی تھی۔ اس لئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کچھ حصہ سمندر کے نیچے سے گزار دیا جائے"۔ اب کے مریم نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

گاڑی سرنگ سے نکل کر پل پر پہنچ چکی تھی۔ میرے دائیں جانب ہوائی چکیاں سمندر میں مضبوطی سے قدم جمائے آہنی پروں کو گھماتے ہوئے 110 میگاواٹ بجلی پیدا کرتی تھیں۔ جن سے مالمو شہر روشن ہوتا تھا۔

"یہ لِل گراؤنڈ (Lilgrund) ونڈ فارم ہے"۔ عماد چاہتا تھا کہ اماں کی معلومات میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

"اور یہ ہوائی چکیاں تعداد میں کتنی ہیں؟"

"اڑتالیس"۔ کھٹ سے جواب آیا۔

عماد کا اپارٹمنٹ شہر کے وسطی علاقے اوسترا پرامینادن (Ostra Promenaden) میں واقع تھا۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے سے گزرتی ہوئی نہر خوبصورت منظر پیش کرتی تھی۔ گھر پہنچ کر ظہر اور عصر کی نماز ادا کی۔ افطار پونے دس بجے ہونا تھا۔ میں نے سفر کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روزہ قضا کر لیا تھا۔ مریم نے مجھے چائے بنا کر دی اور خود افطاری کی تیاری کرنے کچن میں مصروف ہو گئی۔ تین سال کی بے حد خوبصورت گول مٹول گڑیا رجاء اپنا چھلا ہوا گھٹنا مجھے دکھاتے ہوئے نا قابل فہم سے کچھ الفاظ بول رہی تھی۔

''یگ سپرینگا اینڈ دین میں گر گئی''۔

''مریم یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مریم سے سوال کیا۔

''ماما یہ ایک فقرہ سویڈش انگریزی اور اردو میں بولتی ہے''۔ مریم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یگ سپرینگا'' کا مطلب ہے کہ میں دوڑی...... یہ آپ کو بتا رہی ہے کہ میں دوڑی اور پھر میں گر گئی''۔

سات سال کے نٹ کھٹ سے طٰہٰ کو یہ جاننے کی جلدی تھی کہ دادا تایا اور تائی امی نے اس کے لئے کیا تحائف بھیجے ہیں۔ میں نے بیگ کی چابی عماد کے حوالے کی اور سونے چلی گئی کہ مغرب میں ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔

کیا مالمو مسلمان ہو گیا؟

عیدالفطر میں 2 دن باقی تھے۔ عماد اور مریم عید ملن پارٹی کے انتظامات میں مصروف تھے جو بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر واقع پارٹی ہال میں منعقد ہونا تھی۔ عماد اور مریم کے پاکستانی کولیگز کو اپنی فیملیز کے ساتھ شرکت کرنا تھی۔ کیٹرنگ کے لئے ایک انڈین راجیو کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، جس کا مالمو میں کیٹرنگ کا بزنس تھا۔ ہم لوگ ڈسپوزیبل برتن اور کچھ دوسری ضروری اشیاء خریدنے کے لئے مالمو کے مشہور سٹور لوسو فوڈز (Lucu Foods) چلے آئے۔ عماد نے گاڑی پارکنگ میں لگائی۔ سامنے سٹور کی دیوار پر سحر و افطار کا قد آدم ٹائم ٹیبل دیکھ کر حیرت سی ہوئی۔

''کیا مالمو مسلمان ہو گیا؟'' میں نے عماد سے پوچھا۔

''یہ عربوں کا سٹور ہے ماما! ویسے اگر آپ کو سچ مچ کا مسلمان مالمو دیکھنا ہے تو آپ کو کسی دن روزن گارڈ لے چلوں گا۔ آپ کو لگے گا کسی عرب ملک میں گھوم

رہی ہیں''۔

چاندرات کوایک پاکستانی خاتون نے عید بازار کا اہتمام کرر کھا تھا۔ایک بڑے ہال میں جدید فیشن کے پاکستانی ملبوسات، پرس، چوڑیوں اور مصنوعی زیورات کے سٹال لگائے گئے تھے۔ایک کونے میں چھوٹا سا بیوٹی پارلر بنایا گیا ھتا جہاں مہندی، فیشل، تھریڈنگ وغیرہ کی جارہی تھیں۔پاکستانی ماحول بنا ہوا تھا۔

عیدالفطر اتوار کے روز تھی۔سب خوش تھے کہ عید کے لئے چھٹی نہیں لینی پڑے گی۔عیدالفطر کی نماز مالمو کے خوبصورت اسلامک سینٹر میں ادا کی گئی۔سرشام عیدملن پارٹی کے لئے تیار ہو کر نیچے ہال میں پہنچے۔یہ ایک وسیع ہال تھا جس کے ساتھ ملحقہ وسیع باورچی خانہ ہر قسم کی سہولتوں سے آراستہ تھا۔تمام مہمان مہذب، پڑھے لکھے اور مؤدب تھے۔ان بچوں کے ساتھ عید کی شام منانا بہت اچھا لگا۔ابھی تک مالمو مسلمان ہی معلوم ہوتا تھا۔

سونے کا پل اور گمشدہ بلی

عماد کی گاڑی میں ہمارا چھوٹا سا قافلہ اوری سنڈ دیو پوائنٹ کی جانب رواں تھا۔

''دادو! وہ دیکھیں زلاتن ابراہیمووچ کا گھر''۔طٰہٰ نے پُر جوش انداز میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے مطلع کیا۔

''یہ کون ذات شریف ہیں؟''میں نے عماد سے پوچھا۔

''سویڈن کی قومی فٹ بال ٹیم کا کھلاڑی ہے۔بوسنین نژاد ہے''۔عماد کی بجائے مریم نے جواب دیا۔طٰہٰ کا پسندیدہ کھلاڑی ہے''۔

اوری سنڈ کے ساحل پر حقیقی معنوں میں سنہری شام اتری تھی۔دیو پوائنٹ پر

گاڑیاں آ کر رُکتی تھیں اور حسنِ فطرت کے متوالے ماحول کی خوبصورتی کو کیمروں میں قید کرتے تھے۔ سورج ایک بڑے سے سونے کے تھال کی شکل اختیار کئے، سمندر میں غرق ہونے جا رہا تھا۔ مالمو اور کوپن ہیگن کو ملانے والا عظیم الشان اوری سنڈ برج سونے کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سورج بادشاہ نے غروب ہونے سے پہلے اپنا تمام سنہرا پن ماحول کو بخش دیا تھا۔ ساحل پر بنے ہوئے ریسٹورنٹ کے بڑے بڑے شیشوں میں سارے مناظر کے عکس دکھائی دیئے تھے۔

دُور ایک کروز جہاز سمندر کی لہروں پر رواں تھا۔ مالمو کے شفاف نیلے آسمان پر کئی سفید لکیریں ایک دوسری کو کاٹتے ہوئے گزرتی تھیں۔ وہ ان طیاروں نے اپنے پیچھے چھوڑی تھیں جو سامنے ذی لینڈ جزیرے پر واقع کوپن ہیگن ایئرپورٹ پر اترنے کے لئے مالمو کے آسمان سے گولائی میں چکر لگاتے ہوئے بلندی کم کرتے تھے۔

وحشی اور خونخوار وائی کنگز جنہوں نے تاریخِ انسانی کی خوں ریز ترین اور طویل ترین لڑائیاں لڑیں، نہ جانے ادراک کے کس لمحے میں کسی نے پیشہ آباء سپہ گری و قزاقی کو ترک کرتے ہوئے تیغ و تیر و تفنگ ہاتھ سے رکھ دیئے اور پیشہ فرہاد اختیار کرتے ہوئے تیشہ اٹھا لیا اور انہی میں سے جن کو تحقیق و جستجو کی ہڑک اُٹھی وہ رب العالمین کی نشانیوں پر غور کرنے لگے اور کائنات تو شاید روزِ اوّل سے منتظر ہے کہ کوئی اس کو تسخیر کرے۔ بس پھر سمندر راستہ دیتے چلے گئے، ہوائیں چراغ روشن کرنے لگیں، زہروں سے تریاق بننے لگے۔

تو دریا و بحر و سحاب آفریدی
سفینہ و لہر و سراغ آفریدم

ایک دوسرے کے خون کے پیاسے وائی کنگ بادشاہوں کی اولادیں، ڈنمارک کی ملکہ اور سویڈن کے بادشاہ جولائی 2001ء میں مشترکہ طور پر اوری سنڈ کے پل کا افتتاح کرتے تھے۔ خون کی سرخی سنہرے پن میں کتنی صدیوں میں اور کیونکر ڈھلتی ہے؟ شاید اہل خرد کو اس کا جواب دینے کے لئے کتنی کتابیں لکھنی پڑیں۔

تاریکی چھانے سے پہلے ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ سامنے ایک بڑے پتھر پر کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر بلی کی تصویر بنی تھی اور سویڈش زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے عماد؟''

''کسی کی چہیتی بلی کھوگئی ہے ماما! وہ اشتہار لگا گئے ہیں کہ پہنچا کر ثوابِ دارین حاصل کریں''۔

وستراہام کی گرم سہ پہر اور ٹرننگ ٹارسو

طہٰ کے اطالوی دوست کی سالگرہ تھی۔ بلادین انٹرنیشنل سکول میں وہ طہٰ کا ہم جماعت تھا۔ اس کے والد کسی ملٹی نیشنل فرم میں ملازم تھے اور کمپنی کی طرف سے مالمو میں تعینات تھے۔ وہ لوگ دستراہام (Vastra Hamnen) کے علاقے میں رہتے تھے۔ سو طے پایا کہ ہم سب جائیں گے۔ طہٰ کو اس کے دوست کی طرف چھوڑ کر دستراہام گھومیں گے اور ٹرننگ ٹارسو (Turning Torso) دیکھیں گے۔ بھلا مالمو جا کر ٹرننگ ٹارسو نہ دیکھا تو کیا دیکھا۔

اس دن مالمو کا درجہ حرارت 32 سینٹی گریڈ تھا۔ 47 سینٹی گریڈ میں رہنے والوں کے لئے خوشگوار اور مالمو کے باسیوں کے لئے شدید گرم۔

وستراہام انگریزی میں (Westren Harbour) ہے، یعنی مغربی

بندرگاہ، سمندر کے کنارے بنے خوبصورت اپارٹمنٹس میں سے ایک میں ہم نے طٰہٰ کو چھوڑا تاکہ وہ اپنے دوست کی سالگرہ میں شرکت کر سکے۔ اپارٹمنٹس کے سامنے وسیع سبزہ زار خوبصورت منظر پیش کرتا تھا۔ ساحل پر لکڑی کے بنے ہوئے وسیع پلیٹ فارم پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ جلد سنولانے کے شوقین آنکھوں پر دھوپ کے چشمے لگائے سن باتھ لے رہے تھے۔ چار گرہ کپڑے کا بھی بس تکلف ہی تھا۔ خواتین شاید دو گرہ زیادہ پہن لیتی ہوں۔

مالمو کا امتیازی نشان 623 فٹ بلند ٹرننگ ٹارسو شاید رقص کے کسی انداز میں قامت کو ایک بل دیئے کھڑا تھا۔ یہ سکنڈے نیویا کی بلند ترین عمارت ہے جو رہائشی فلیٹس پر مشتمل ہے۔ اس کی 54 منزلیں ہیں۔ دُور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے جیسے دس مکعب نما اُوپر نیچے رکھ کر گولائی میں ہلکا سا گھما دیا گیا ہو۔ ہر مکعب نما بلاک پانچ منزلوں پر مشتمل ہے۔ مالمو کی یہ عمارت سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا مرکز ہے۔ 32 سینٹی گریڈ کا درجہ حرارت میرے لئے زیادہ نہ تھا، لیکن جانے کیوں جلد پر سوئیاں چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔

''یورپ کی دھوپ ایسی ہی ہے''۔ مریم میری سرخ ہوتی ہوئی جلد کو دیکھ کر بولی۔ ''یہاں سن برن جلدی ہو جاتا ہے۔ آیئے کہیں سائے میں چلتے ہیں''۔ ہم قریبی درختوں کی طرف چل دیئے۔ سائے میں سکون محسوس ہوا۔ مریم نے بیگ سے ایلو ویرا جل (Aloevera Gel) نکال کر اپنے اور میرے چہرے اور ہاتھوں پر لگایا۔

''اور یہ جو سنولانے کے شوقین ہیں، ان کو جلن نہیں ہوتی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اپنا شوق پورا کرنے کو ہر تکلیف برداشت کر لیتے ہیں''۔ مریم نے جواب دیا۔ ''سانولے پھر بھی نہیں ہوتے۔ آپ دیکھ رہی ہیں عجیب بدرنگ نارنجی پن

آ جاتا ہے۔ ان کی جلد پر، سنولانے والا قدرتی مادہ ''میلانن'' ان کی جلد میں پایا ہی نہیں جاتا''۔

اور میں اپنے دیس کے باسیوں کو سوچنے لگی جو گورے ہونے کی کوشش میں جانے کون کون سی کریمیں تھوپتے رہتے ہیں، بھلا اللہ تعالیٰ نے جس کو جیسا بنا دیا ویسا رہنے میں کیا حرج ہے، لیکن ہائے ری انسانی فطرت کی لامحدود خواہشات، اگر ایسا نہ ہو تو یورپ میں Taning Lotion اور ایشیا میں رنگ گورا کرنے والی مصنوعات بنانے والے اپنی روزی روٹی کیسے کمائیں؟

طٰہٰ صاحب کا فون آ گیا تھا۔ وہ اپنے دوست کی سالگرہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ ہم اس کو لینے اس کے دوست ''لوقا'' کے اپارٹمنٹ پر پہنچے۔ لوقا کی ممی ٹینا عام یورپین کے برعکس ڈارک براؤن بالوں والی خوبصورت لڑکی تھی۔ بہت محبت سے ملی اور اپنے گھر آنے پر اصرار کرنے لگی۔ ہم اس اطالوی حسینہ کی دعوت قبول کر لیتے اگر اس کے بازوؤں میں سیاہ رنگ کا پوڈل (کتا) نہ کھیل رہا ہوتا۔ میں نفسیاتی طور پر کتوں سے الرجک ہوں اور عماد یہ بات جانتا تھا۔ سو معذرت کی اور پھر کبھی آنے کا کہہ کر رخصت ہوئے۔ آج مجھے لگا تھا کہ میں واقعی یورپ میں ہوں۔

واپسی پر میرے بچے ویک اینڈ کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ''ڈنمارک چلیں گے، ہیلسے نور کا قلعہ دکھائیں گے ماما کو''۔

''کیا ہے بھئی! ابھی مالمو تو پورا دیکھا نہیں اور ڈنمارک چل دیں''۔ میں نے احتجاج کیا۔

''مالمو بھی دیکھتے رہیں گے، لیکن ویک اینڈ تو ضائع نہیں کرتے''۔ عماد کہنے لگا۔

''اور آپ کون سا روز روز کہیں آتی جاتی ہیں۔ اب اگر گھر سے نکل ہی آئی ہیں تو ہم آپ کو گھمائے پھرائے بغیر نہیں جانے دیں گے''۔

''میری مجبوری تم لوگ جانتے ہو''۔

''جی ماما!'' عماد بھی سنجید ہو گیا۔ ''صغریٰ کی وجہ سے آپ کا کہیں بھی آنا جانا محدود ہو کر رہ گیا ہے، لیکن اب تو آپ آ گئی ہیں اور صغریٰ کے پاس بھی ارم (پھوپھی زاد بہن) رہنے کے لئے آ گئی ہے''۔

''ہاں، یہ ایک اچھی بات ہو گئی ہے۔ مجھے دلی اطمینان ہوا ہے''۔

''تو پھر ٹھیک ہے، اس ویک اینڈ پر چلیں گے۔ ہیلسے نور کا قلعہ دیکھنے۔ ڈنمارک اور سویڈن کے درمیان ہونے والی جنگوں کی یادگار ہے۔ شیکسپیئر نے مشہور زمانہ ڈرامہ ''ہیملٹ'' (Hamlet) اسی قلعے کے پس منظر میں لکھا ہے۔ ہم کار میں مالمو سے ہیلسنبرگ (Helsingborg) جائیں گے۔ وہاں سے فیری کے ذریعے ہیلسے نور پہنچیں گے، فیری کا سفر آدھے گھنٹے کا ہے لیکن آپ بہت انجوائے کریں گی۔ واپسی پر کوپن ہیگن سے ہوتے ہوئے مالمو آئیں گے۔ بہت مزا آئے گا''۔

''جیسے تمہاری مرضی''۔ میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''جہاں جی چاہے لے پھرو اماں کو''۔

ہیلسنگر گ کا خوبصورت سفر

اس روز ہفتہ تھا اور ہم نے (Helsingor) قلعہ دیکھنے جانا تھا، جس کو (Elsinor) بھی کہتے ہیں۔ یہ قلعہ (Koronborg Castle) کے نام سے مشہور ہے۔ بعض لوگ اس کو ہیملٹ (Hamlet) کا قلعہ بھی کہتے ہیں۔

"مائی ڈیئر عماد نصیر! پانچ منٹ میں غسل فرما کر تشریف لے آیئے"۔ مریم باورچی خانے میں ناشتہ بناتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ "آپ کے 45 منٹ پر محیط طویل دورانیے کے غسل کی بدولت متعلقہ محکمے نے نوٹس جاری کر دیا ہے کہ ہم اپنی مقررہ مقدار سے زیادہ پانی استعمال کر رہے ہیں۔ بس اب آ جایئے کہ "راحتیں اور بھی ہیں غسل کی راحت کے سوا" اور ہاں، ہمیں دس بجے تک ہر صورت گھر سے نکل پڑنا چاہیے، کیونکہ چار بجے قلعے میں داخلہ بند کر دیا جاتا ہے"۔

عماد تولیے سے بال رگڑتے ہوئے باتھ روم سے برآمد ہوا۔ "دیکھا ماما! آپ کی بہو کی اردو کتنی اچھی ہو گئی ہے"۔

"ہاں واقعی!" میں نے حیرت آمیز مسرت سے کہا۔ "کانونٹ میں پڑھنے

والیوں کی اردو اتنی اچھی نہیں ہوتی"۔

"سب آپ کے بیٹے کی محنت کا اثر ہے"۔عماد نے فرضی کالر کھڑے کئے۔

"جلدی سے ناشتہ کریں"۔مریم نے اسے میز کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔"اِترا بعد میں لیجئے گا"۔

ساڑھے دس بجے ہم سویڈن کے ساحلی شہر ہیلسنبرگ (Helsnborg) جانے والی شاہراہ پر سفر کررہے تھے۔ جہاں سے ہم نے فیری کے ذریعے ہیلسنگور پہنچنا تھا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی گندم کے وسیع کھیت شاہراہ کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔اگست کا مہینہ تھا، فصل کی کٹائی جاری تھی۔بعض جگہوں پر گندم اٹھائی جا چکی تھی اور بھوسے کے بڑے بڑے گول سنہری پہیہ نما گٹھے خالی کھیتوں میں پڑے تھے۔

کرۂ ارض کا درجہ حرارت بڑھنے سے جہاں اکثر ممالک میں تشویش پائی جاتی ہے اور بہت سی ماحول دوست تنظیمیں عوام الناس کو گلوبل وارمنگ کے ممکنہ اثرات سے آگاہ کررہی ہیں، وہیں اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ فائدہ سیکنڈے نیوین ممالک کو ہورہا ہے۔گندم، جَو، مکئی، سورج مکھی، سویابین جیسی فصلوں کے لئے موسم موافق ہوتے جارہے ہیں، مگر ماحول کے حوالے سے تشویش یہاں بھی پائی جاتی ہے۔شدید سرد موسم میں نمو پانے والے بعض اقسام کے درخت اور جانور ناپید ہونے کا خطرہ محسوس کیا جارہا ہے۔

"گو کہ شاہراہ غیر معمولی چوڑائی کی حامل نہ تھی۔دو ٹریک آنے کے اور دو جانے کے تھے، مگر ٹریفک بغیر کسی خلل کے رواں تھی۔اس کی جو وجہ میری سمجھ میں آسکی وہ یہ تھی کہ یہاں ریلوے اور آبی گزرگاہوں سے استفادہ کیا جاتا ہے، لہٰذا سڑکوں پر ٹریفک کا زیادہ دباؤ نہیں پڑتا اور دوسرے بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی کسی

میں مجال نہیں۔

بعض گاڑیوں کے پیچھے کارواں (Carvan) لگائے گئے تھے، کئی جیپوں کی چھتوں پر سائیکلیں بندھی تھیں، گویا اہل شہر ویک اینڈ سے لطف اندوز ہونے کے لئے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ راستے کے مناظر بے حد خوبصورت تھے۔ آسمان کی شفاف نیلی چادر پر بادل دھنکی ہوئی روئی کے ڈھیروں کی صورت جا بجا بکھرے تھے۔ گھنے سرسبز درختوں کی بلند و بانگ چوٹیاں بادلوں سے جانے کون سے بھید کہتی تھیں۔ بائیں ہاتھ سمندر شاہراہ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ ایسے مناظر کی میرے دیس میں کمی تو نہیں میرا اپنا بچپن سندھ ساگر کے ساحلوں کی ریت پر کھیلتے کودتے اور سرسبز پہاڑیوں پر بھاگتے دوڑتے گزرا تھا۔ امتدادِ زمانہ نے کنکریٹ کے جنگلوں میں پھینکا تو وہ خوبصورت مناظر خواب ہوتے چلے گئے۔ جیتے رہو میرے بچو! خوش رہو کہ میری آنکھوں میں چار دہائیوں سے خواب ہوتے منظروں کو تم نے زندہ کر دیا۔

''ماما! کیسا لگ رہا ہے، آپ کو یہ سب؟'' مریم پوچھ رہی تھی۔

''بہت اچھا، بہت خوبصورت''۔ میں جو اپنے آئی فون سے تصویریں کھینچ کر فیس بک پر اَپ لوڈ کرنے میں مصروف تھی، مختصر جواب دیا۔ عماد چڑ گیا۔

''لوگ اپنے بچوں کے فیس بک کے شوق سے تنگ ہوتے ہیں اور میں اپنی اماں کے...... پلیز ماما! کوئی گپ شپ کریں، ہمارے ساتھ، یہ کام بعد میں کر لیجئے گا''۔

''چلو جی! ڈن''۔ میں نے آئی فون ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ ''اب صرف آپ لوگوں سے باتیں ہوں گی یا تصویریں کھینچوں گی، نو فیس بک، اب خوش؟''

''بالکل خوش''۔ عماد نے جواب دیا۔ ''اور اب ہم ہیلسنبر گ پہنچتے ہی والے ہیں''۔

بیس منٹ کے سفر میں دس منٹ کی شاپنگ

ہیلسنبرگ آبادی کے لحاظ سے سویڈن کا چوتھا بڑا شہر ہے اور ہمسایہ ملک ڈنمارک سے قریب ترین ہے۔ تقریباً ستر فیری (Ferry) روزانہ ہیلسنبرگ اور ہیلسنگور کے درمیان سفر کرتے ہیں۔ یہ روٹ (H.H ferry rout) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

بندرگاہ کے ٹول پلازہ پر لگے بیریئر کے سامنے رک کے عماد نے سائیڈ پر لگی مشین میں اپنا ڈیبٹ کارڈ سوائپ کیا۔ ڈائل پر لگے نمبر انگلی سے چھوئے مشین نے کرایہ وصول کرلیا اور آہنی بیریئر نے اُوپر اُٹھ کر ہمیں اندر داخلے کی اجازت دے دی۔ عماد نے گاڑی بڑھائی اور تین چار موڑ مڑنے کے بعد ہم فیری میں داخل ہوگئے، جس کے ماتھے پر Scandlines کے الفاظ چمک رہے تھے۔ گاڑی پارکنگ میں لگا کر ہم لفٹ کی طرف بڑھے۔ ایک ضعیف العمر مگر چاک و چوبند سفید فام جوڑا بھی ہمارے ساتھ لفٹ میں داخل ہوا۔

''ہائے!'' یورپی لوگوں کی عادت کے مطابق انہوں نے ہماری طرف مسکراہٹ اچھالی۔

''ہائے!'' جواباً ہمیں بھی مسکرانا اور ہائے ہائے کرنا پڑا حالانکہ اپنے دیس کے رواج کے مطابق ہم اجنبی لوگوں کو دیکھ کر مسکرانا تو کجا سلام تک نہیں کرتے، ہم جن کو ہادی برحقؐ نے ہدایت فرمائی تھی کہ سلام کرنے میں پہل کرو اور اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرانا صدقہ ہے۔ سارے سبق فراموش کرکے زمانے میں خوار ہو رہے ہیں۔

''عماد! عرشے پر چلتے ہیں، بیس پچیس منٹ کا تو سفر ہے، سمندر کا نظارہ کرتے چلیں گے''۔

"نوپاپا! کیفے ٹیریا"۔ رجاء ٹھنکنے لگی۔

"ٹھیک ہے پہلے کیفے ٹیریا ہی چلتے ہیں"۔ رجاء کی بات کم از کم میں نہ ٹال سکتی تھی۔

"We have our own cafeteria"

ضعیف العمر سفید فام عورت اپنے کندھے سے لٹکے توشہ دان کو تھپ تھپا کر خوش دلی سے مسکرائی۔

تیسرے فلور پر کیفے ٹیریا تو بس نام کو ہی تھا۔ حقیقت میں ایک وسیع ڈیوٹی فری شاپ تھی۔ ہر طرح کے چاکلیٹ، کینڈیز، بسکٹس، کاسمیٹکس اور سکن کیئر کے برانڈز مثلاً لوریل، الزبتھ آرڈن اور باڈی شاپ نے اپنے سٹال سجا رکھے تھے۔ جوسز، سافٹ ڈرنکس اور آئس کریم کی ڈھیروں ورائٹی کے ساتھ ساتھ ہارڈ ڈرنکس بھی موجود تھے۔ بچے اپنی پسند کی چاکلیٹ بسکٹس اور چپس وغیرہ منتخب کرنے میں مصروف تھے اور میں کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے باہر کا نظارہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مریم اپنے موبائل سے میری اور اپنی سیلفیاں (Selfies) بنانے لگی۔ ابھی جہاز کی روانگی میں چند منٹ باقی تھے۔

"مریم! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی"۔

میں نے مریم سے کہا۔ "بیس منٹ کے سفر میں ایسی کون سی شاپنگ لوگوں کو کرنا ہوتی ہے جو ایسی وسیع و عریض ڈیوٹی فری شاپ سجانے کی ضرورت پیش آ گئی"۔

"ماما! آپ دیکھ تو رہی ہیں اپنے پوتے پوتی کو جیسے چاکلیٹ اور کینڈیز خریدنے ہی تو آئے ہوں اور جب چیزیں اتنی خوبصورتی سے سجی ہوں تو نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ تو لوگ خرید ہی لیتے ہیں۔ ہزاروں لوگ اس روٹ پر روزانہ سفر کرتے ہیں۔ تاجرانہ ذہن تو ایسے موقع کی تلاش میں رہتا ہے"۔

فیری حرکت میں آچکی تھی اور پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ عماد باسکٹ اٹھائے ادائیگی والے کاؤنٹر پر قطار میں کھڑا تھا۔ دس منٹ اور سرک گئے۔ آدھا سفر تمام ہوا۔

''سوری ماما! آپ عرشے سے سمندر کا نظارہ کرنا چاہ رہی تھیں، لیکن بچوں کی شاپنگ کے چکر میں اتنا وقت نکل گیا''۔ میرا بیٹا شرمندہ ہو رہا تھا۔

''کوئی مسئلہ نہیں بیٹا! آؤ اب اُوپر چلتے ہیں''۔

عرشے پر کچھ نوجوان گٹار ایک طرف رکھے دھوپ میں نیم دراز اونگھ رہے تھے۔ ایک طرف ''مکمل سویڈش خاندان'' فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھا تھا۔ ''مکمل سویڈش خاندان''، یعنی ایک عورت ایک مرد (جن کا میاں بیوی ہونا ضروری نہیں اکثر وہ اپنی یکجائی کے لئے شرع و قانون کی پابندی ضروری خیال نہیں کرتے) ایک بیٹا ایک بیٹی اور ایک ...... کتا۔ ان کا لحیم شحیم کتا اپنی اگلی ٹانگیں دراز کئے ان پر اپنی تھوتھنی رکھے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اوہو! یہ تو بہت ہی کتا ہے''۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''اور آپ ٹینا کے معصوم سے کتے سے پریشان ہو گئی تھیں، جو کوئی اتنا کتا بھی نہ تھا''۔ مریم ہنستے ہوئے بولی۔

''وہ رہا کرون برگ کاسل''۔ عماد نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''بس ہم دو تین منٹ میں لنگر انداز ہونے والے ہیں''۔ بالٹک کے پانیوں پر سفید بادبان پھڑپھڑاتے دکھائی دیتے تھے۔ شاید کچھ من چلے (Yatching) سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور

سمندر کنارے کرون برگ قلعہ جو کبھی سرزمین ڈنمارک کے جنگجوؤں اور بادشاہوں کا مسکن رہا تھا۔ سیاحوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ چمکتا دھوپ بھرا دن سیاحت کے لئے بڑا ساز گار تھا۔

میری ٹائم میوزیم اور کرون برگ کا بندی خانہ

قلعے سے ذرا پہلے ایک کشتی نما عمارت پر نظر پڑی جو سطح زمین سے قدرے نیچے بلکہ زیرزمین کہی جا سکتی تھی۔ ڈھلوان پل نما راستے اندر جانے کے لئے بنائے گئے تھے۔

''یہ میری ٹائم میوزیم ہے''۔ عماد نے بتایا۔ ''پہلے قلعے کے اندر تھا پھر 2013ء میں اس نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا''۔

''یہ بھی دیکھیں گے آج؟''

''میرا خیال ہے آج کے دن میں ہم صرف قلعہ ہی دیکھ پائیں گے، اس کو کسی اور دن کے لئے رکھتے ہیں''۔ عماد نے بتایا۔

کرون برگ کاسل کے دھاتی گنبد اور مینار غالباً نم آلود سمندری ہواؤں کے زیر اثر رہنے سے سبز رنگ کے ہو چکے تھے۔ عمارت چاروں طرف سے پانی میں گھری تھی اور ایسا غالباً دفاعی مقاصد کے لئے کیا جاتا ہوگا۔ پانی کی اس نہر پر واقع پل سے گزر کر قلعے میں داخل ہوئے۔ ٹکٹ کاؤنٹر پر موجود خوش قامت اور خوش رُو ڈینش لڑکی نے ٹکٹ دینے کے ساتھ تھوڑی سی رہنمائی بھی کی اور مسکراہٹ بھی لٹائی۔

''سوینئر شاپ مین گیٹ کے دائیں ہاتھ ہے، بالکل سامنے گرجا کی عمارت تہہ خانے میں جیل اور اُوپر رائل اپارٹمنٹس، ویسے آپ چاہیں تو گائیڈ بھی لے سکتے ہیں''۔ اس نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے کہا۔

''TAK!'' (شکریہ) عماد نے ٹکٹ جیب میں ڈالے اور ہم بلند و بالا سرخ چوبی

پھاٹک کی طرف بڑھے، جس کے دونوں طرف بنے محرابی طاقچوں میں مجسمے ایستادہ تھے۔

''عمادی! 90 کرونے کا ٹکٹ مہنگا نہیں؟'' میں نے اپنی کفایت شعاری کی بری عادت کے مطابق کرونے کو سولہ سے ضرب دے کر روپوں میں تبدیل کیا۔ ''1440 روپے بنتے ہیں''۔

''اگر اسی طرح ضرب تقسیم کرتی رہیں تو ہر چیز مہنگی لگے گی''۔ عماد میرے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''اور میری پیاری امی جان کو ایسی فکروں سے اجتناب کرنا ہے اور ہاں، ہم گائیڈ نہیں لیں گے۔ قلعے میں جگہ جگہ اس کی تاریخ رقم ہے''۔

قلعے کے سنگی فرش والے وسیع و عریض صحن کے چاروں طرف بیرکیں بنی تھیں۔ یہ ایک چار منزلہ بلند عمارت تھی، بالکل سامنے شاہی گرجا گھر تھا، جس کے منقش چوبی دروازے کے اُوپر طاقچے میں ابن مریم کا مجسمہ عصا ہاتھ میں تھامے ایک قدم آگے بڑھائے رُک سا گیا تھا۔ جیسے تیز تیز چلتے ہوئے یسوع کے کسی لمحے کو مجسم کر دیا گیا ہو۔ گرجا کی عمارت کے اندر لگے سنہری فانوس گیلریاں اور صاف ستھرے چمکتے فرش دیکھ کر آثار قدیمہ کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔

ان دنوں وہاں ہیملٹ فیسٹیول جاری تھا۔ شیکسپیئر کے لکھے ہوئے ڈرامے کو مختلف کمپنیاں سٹیج پر پیش کرتی تھیں۔ وسیع صحن میں ایک طرف سیٹ لگایا گیا تھا۔ ساؤنڈ سسٹم لگانے والے اپنا کام کر رہے تھے۔ ڈنمارک کی تاریخ میں ہیملٹ نامی کسی شہزادے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ ایک فرضی کردار ہے جس کو شیکسپیئر نے اتنی خوبصورتی سے تخلیق کیا کہ وہ ایک حقیقی کردار سمجھا جانے لگا۔

اس کی ایک مثال انارکلی کا کردار ہے جس کو امتیاز علی تاج نے تخلیق کیا کہ وہ حقیقی

کرداروں سے زیادہ مقبولیت حاصل کر گئی۔

شیکسپیئر کے لکھے ہوئے بعض مکالمے جو ہیملٹ کی زبان سے ادا ہوئے، زبان زدعام ہوئے اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے۔

جیسے To be or not to be, this is the question

قلعے کے احاطے میں دیس دیس سے آئے سیاحوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ بعض ٹولیوں کے ساتھ گائیڈ تھے۔ لوگ ایک ایک چیز کو دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ ایک طرف لگا قدیم ہینڈ پمپ کچھ عرب بچوں کی دلچسپی کا خصوصی مرکز تھا۔ کوئی اس کی ٹونٹی پکڑ کر جھولتا تھا، کوئی ہینڈل کو چھو کر دیکھتا تھا اور کوئی زمین میں گڑے پائپ سے لپٹتا تھا۔ ایک گہری سانولی رنگت کا آٹھ نو سالہ بچہ طہٰ کی طرف لپکا، دونوں بچوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

یہ دیپک ہے میرا کلاس فیلو۔ طہٰ نے تعارف کروایا۔

اس کے والدین سے تعارف کا مرحلہ طے ہوا۔ دھان پان سے گہری رنگت والے میاں بیوی بھارتی شہر مدراس سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر وہ خود نہ بتاتے تو میں کبھی یقین نہ کرتی کہ بوسیدہ جینز اور بدرنگ ٹی شرٹس پہنے ہوئے وہ لوگ سافٹ ویئر انجینئرز تھے۔

ہم نے پہلے تہ خانے میں جا کر بندی خانہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ تہ خانے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جس چیز سے سامنا ہوتا ہے وہ Holger Danske (انگریزی میں Ogler the Dane کا سنگی مجسمہ ہے جو مکمل جنگی لباس میں ملبوس بائیں طرف ڈھال اور گود میں تلوار رکھے اس پر دونوں بازو ٹکائے، پتھریلے تخت پر براجمان ہے۔ یہ ایک دیومالائی کردار ہے جو کرون برگ کے تہہ خانے میں سوتا ہوا خواب

میں پورے ڈنمارک کو دیکھ رہا ہے۔ جس دن کوئی مصیبت اس کے ملک پر آئے گی وہ اُٹھ کھڑا ہوگا اور اہلِ ڈنمارک کا نجات دہندہ بن جائے گا۔ انسان کہیں کا بھی ہو، بھارت، افریقہ، برما کے جنگلوں کا باسی یا ترقی یافتہ ترین سکنڈے نیویا کا رہنے والا، خیال و خواب کی کیسی کیسی جنتیں ایجاد کرتا ہے اور پھر ان پر ایمان لا کر خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ واقعی بقول شاعر

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں، خواب منصور ہیں

میرے اپنے نظریے کے مطابق خواب اُمید کا استعارہ ہیں اور امید ہی بندے کو اللہ سے ملاتی ہے۔ میرے ذاتی مشاہدے میں آنے والے منکرین خدا کی زیادہ تعداد مایوس و ناامید لوگوں پر مشتمل ہے۔

کرون برگ کاسل کے تہہ خانے میں بنے زندان کی سرد تاریک سرنگیں تنگ کوٹھڑیاں اور دیواروں سے رستی نمی عجیب ڈراؤنا وحشت ناک ماحول پیدا کرتی تھیں۔ مدھم مصنوعی روشنیوں سے پیدا شدہ پُراسراریت دل میں خوف کی سی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ صدیوں پہلے جو لوگ یہاں لائے جاتے تھے، کیا ان کے نصیب کی روشن کرنیں باہر ہی کہیں

رہ گئیں؟ کیا وہ کبھی باہر کی دُنیا کو دیکھ پائے یا ان سرد بے حس اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں اپنی سانسوں کو گنتے رہے؟ ان میں کتنے مجرم تھے اور کتنے محض شاہوں کے عتاب کا نشانہ بنے؟ یہ سب تاریخ میں دفن ہو چکا، لیکن تاریخ دہرائی جاتی رہے گی۔ کرون برگ کے تہہ خانے میں نہیں تو کسی گوانتانا موبے کے عقوبت خانے میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ڈنمارک کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ملکہ میتھلڈا جو کہ کرسچین ہفتم کی بیوی اور فریڈرک ششم کی ماں تھی اور برطانیہ کے کنگ جارج سوم کی بہن تھی۔ 1772ء عیسوی میں اس شاہی عقوبت خانے میں محبوس کی گئی، کیرولین میتھلڈا کا شوہر کرسچین ہفتم ذہنی مریض تھا۔ ملکہ سے اس کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ 1768ء میں ان کا بیٹا شہزادہ فریڈرک پیدا ہوا جو بعد میں فریڈرک ششم کے نام سے تخت نشین ہوا۔ شہزادے کی پیدائش کے بعد بادشاہ نے اپنی ایک درباری عورت کیتھرین سے تعلقات پیدا کر لئے۔ تنہائی اور مایوسی کا شکار نوجوان ملکہ اپنے شوہر کے جرمن معالج سترونسی (Struensee) میں دلچسپی لینے لگی اور اس جرم میں زنداں کی مکین ہوئی۔ ملکہ کے بڑے بھائی جارج سوم کی کوششوں سے رہائی عمل میں آئی اور کیرولین میتھلڈا ایک بحری جہاز کے ذریعے دوبارہ انگلستان پہنچادی گئی، لیکن اس کو دربار انگلیشیہ میں بھی قبول نہ کیا گیا۔ جارج سوم نے اس کو باور کرایا کہ وہ اپنے بُرے کردار کی وجہ سے اپنی ماں کی موت کی ذمہ دار ہے۔

بندی خانے سے باہر نکل کر گہرے سانس لئے تو گھٹن کا احساس کچھ کم ہوا۔ سکون محسوس کرتے ہی سووینئر شاپ میں داخل ہوئے اور قدیم طرز کے بحری جہاز کا ایک ماڈل خریدا۔ قلعے کی تصویروں والے کی چین بھی خرید لئے کہ جس کسی کو تحفے میں دیں گے، ساتھ شو ماریں گے "ڈنمارک میں کرون برگ کاسل دیکھنے گئے تھے نا، وہیں سے لئے ہیں"۔

شاہوں کے عشرے کدے

یہاں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔طویل راہداریوں میں چھتوں سے لٹکے قیمتی فانونس، منقش چوبی الماریاں اور آرائش کا دیگر سامان سب کچھ اتنا صاف ستھرا اور ترتیب سے رکھا ہوا، گویا کہ ابھی بھی یہ شاہی رہائش گاہ ہو۔ قلعے کی تاریخ اور اہم واقعات ملٹی میڈیا کے ذریعے دیواروں پر دکھائے جارہے تھے۔ واقعتاً یہاں گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔

بحیرہ بالٹک کے کنارے ایستادہ یہ قلعہ 1420ء میں ایرک ہفتم نے تعمیر کروایا تھا۔ بالٹک سے گزرنے والے جہاز یہاں ٹول ٹیکس ادا کرتے تھے۔ 1585ء میں فریڈرک دوم نے اس کو شاہی رہائش گاہ میں بدل دیا۔ شاہی نشست گاہ کے طور پر استعمال ہونے والے ہال کی تزئین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دیوار گیر منقش قالین زیادہ تر شکار کے مناظر سے مزین تھے۔ چھت بھی پینٹنگو سے آراستہ تھی۔ سہ پہلو دریچوں کی چھتوں پر بھی خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ میزوں پر خوبصورت کراکری یوں سجی تھی، گویا کہ بادشاہ سلامت طعام کے لئے تشریف لانے والے ہوں۔ آراستہ و پیراستہ آتش دان کے اُوپر بچوں کے مجسموں کے علاوہ ایک بڑا مرتبان نما گلدان رکھا تھا۔ چینی کے سفید گلدان پر نیلے رنگ کے نقش و نگار بنے تھے جس کو ہمارے ہاں ملتانی آرٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ دریچوں سے قلعے کی فصیل پر لگی توپیں، بیرونی پھاٹک اور سمندر تک سارا منظر واضح دکھائی دیتا تھا۔

1629ء میں آگ لگنے سے یہ قلعہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ ایک کمرے میں ملٹی

میڈیا کے ذریعے قلعے کی آگ کے مناظر یوں دکھائے جا رہے تھے کہ دیکھنے والے خود کو منظر کا حصہ محسوس کرنے لگتے۔ دل پر دہشت طاری ہوتی تھی۔ قلعے کو فریڈرک سوم نے دوبارہ تعمیر کرایا۔ 1645ء میں ڈنمارک اور سویڈن کے درمیان جنگ ہوئی اور سویڈن نے ڈنمارک کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ 1657ء میں جب سویڈن کا بادشاہ چارلس دہم پولینڈ میں برسرِ پیکار تھا، فریڈرک سوم نے کھویا ہوا علاقہ واپس لینے کا موقع جانا اور سویڈن پر حملہ کر دیا مگر شکست کھائی۔ چارلس دہم کی فوجوں نے قلعے پر قبضہ کرلیا اور کئی بیش قیمت نوادرات مالِ غنیمت کے طور پر لوٹ لئے۔ 1785ء میں قلعے کو دوبارہ فوجی بیرکس میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1923ء میں قلعے کو ضروری تزئین و آرائش کے بعد عوام کے لئے کھول دیا گیا۔ اب یہ یونیسکو کے عالمی ورثے میں شامل ہے۔

شاہی خواب گاہیں اسی طور آراستہ تھیں، جیسے شاہوں کی زندگی میں ہوتی ہوں گی۔ جس چیز نے مجھے چونکایا وہ بیڈ کا غیر معمولی چھوٹا ہونا تھا۔ ڈینش لوگ اچھا قد و قامت رکھنے والے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بیڈ چھوٹے تھے۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں پتہ چلی۔ ڈنمارک کے قدیم باشندوں کا خیال تھا کہ لیٹ کر سونے سے خون دماغ کو چڑھ جاتا ہے، لہٰذا وہ بیٹھے بیٹھے ٹیک لگا کر سوتے تھے۔ ان بستروں پر آسودہ خواب ہونے والے رزقِ خاک ہو چکے، سامان یہیں پڑا ہے مگر سامان استعمال کرنے والوں کے مدفن کو بھی شاید چند ہی لوگ جانتے ہوں۔

عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

لکڑی کی چھت اور ٹائل کے فرش والا وسیع و عریض بال روم جو تقریباً 60 میٹر لمبا اور 13 میٹر چوڑا ہے، یورپ میں اپنے وقت کا سب سے بڑا بال روم تھا۔ اس کی

آرائش بھی دیگر حصوں کی طرح تھی۔ چھتوں سے لٹکے عالی شان فانوس اور دیوار گیر منقش قالین دیدہ زیب فرنیچر مگر ایک چیز بہت مختلف تھی۔ شیشے کے چوکور ڈبے میں ہالوگرام تکنیک سے ایک منظر تخلیق کیا گیا تھا۔ 1535ء کے بال روم ڈانس کا منظر...... کچھ جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بال روم میں رقص کناں تھے اور ایک نوجوان بنچ پر بیٹھا کوئی یورپی ساز بجا رہا تھا، وہ سب روشنی کے ہیولوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ گویا پانچ صدیاں پہلے کے کچھ لمحے چرا کر شیشے کے باکس میں بند کر دیئے گئے تھے۔ میرے لئے یہ ایک نیا اور انوکھا منظر تھا۔

تین گھنٹے تک مسلسل چلتے رہنے اور سیڑھیاں اترنے چڑھنے سے پاؤں بُری طرح دُکھنے لگے تھے۔ ''بس بھئی بچو! اب میری تو ہمت تمام ہوگئی، اب نکلو یہاں سے''۔

''آپ تو کہہ رہی تھیں کہ سپین لے چلو، الحمرا اور مسجد قرطبہ دکھا کر لاؤ''۔ وہ مجھے چھیڑتے ہوئے بولے۔ ''خیر کوئی بات نہیں، جب آپ اگلی دفعہ آئیں گی تو سپین چلیں گے''۔

''وہاں بھی اتنا ہی پیدل چلنا پڑتا ہے؟''

''نہیں، اتنا تو نہیں......اس سے ذرا زیادہ''۔

عماد شرارت سے کہہ رہا تھا۔

واپسی کا سفر بائی روڈ تھا۔ 40 منٹ کی ڈرائیو کے بعد کوپن ہیگن پہنچے۔ ایک مشہور عرب ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کر ایک نئے آئس کریم پارلر کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جس کے بارے میں مریم کی کسی دوست نے بتایا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ہم نے منزل مراد کو پا ہی لیا۔ وہاں کا فروزن یوگرٹ واقعی عمدہ تھا۔
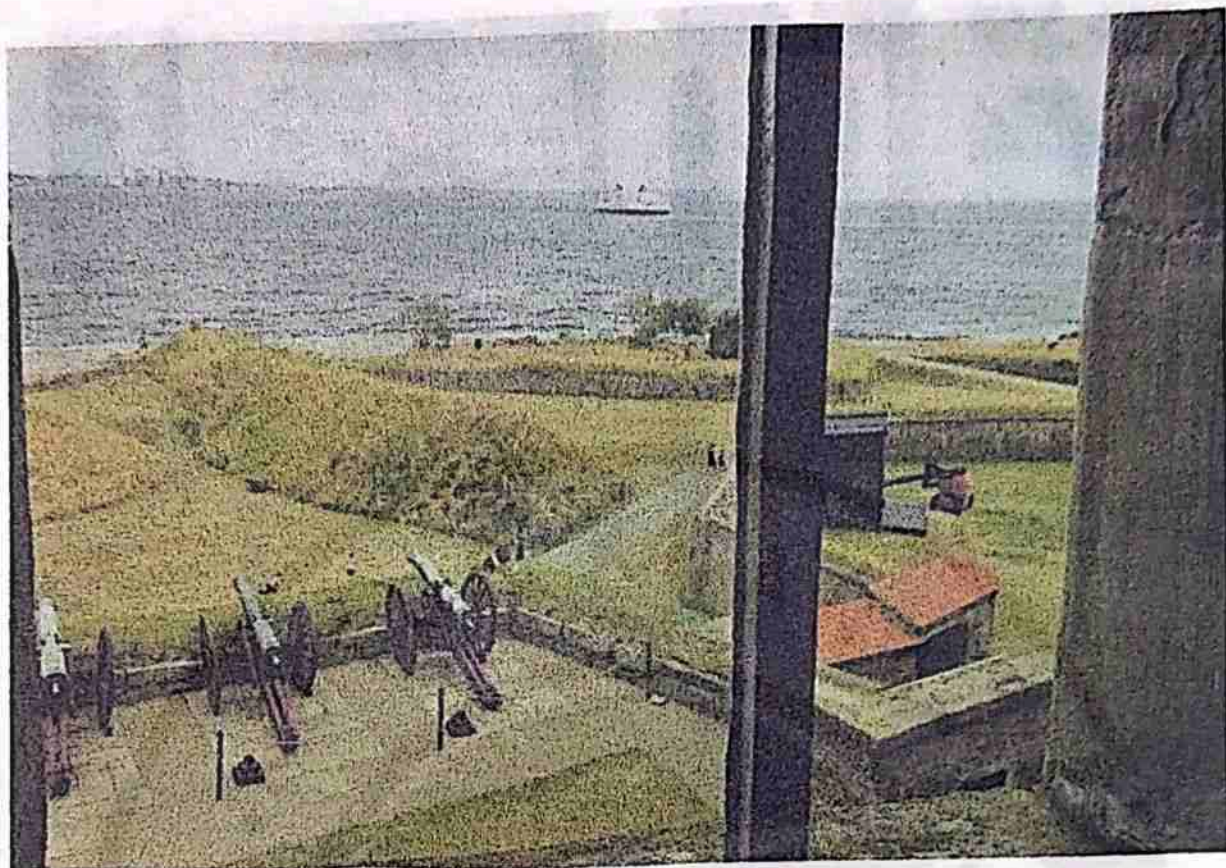
شاہی نشست گاہ کی کھڑکیوں سے باہر کا منظر۔توپیں نمایاں ہیں (۲)
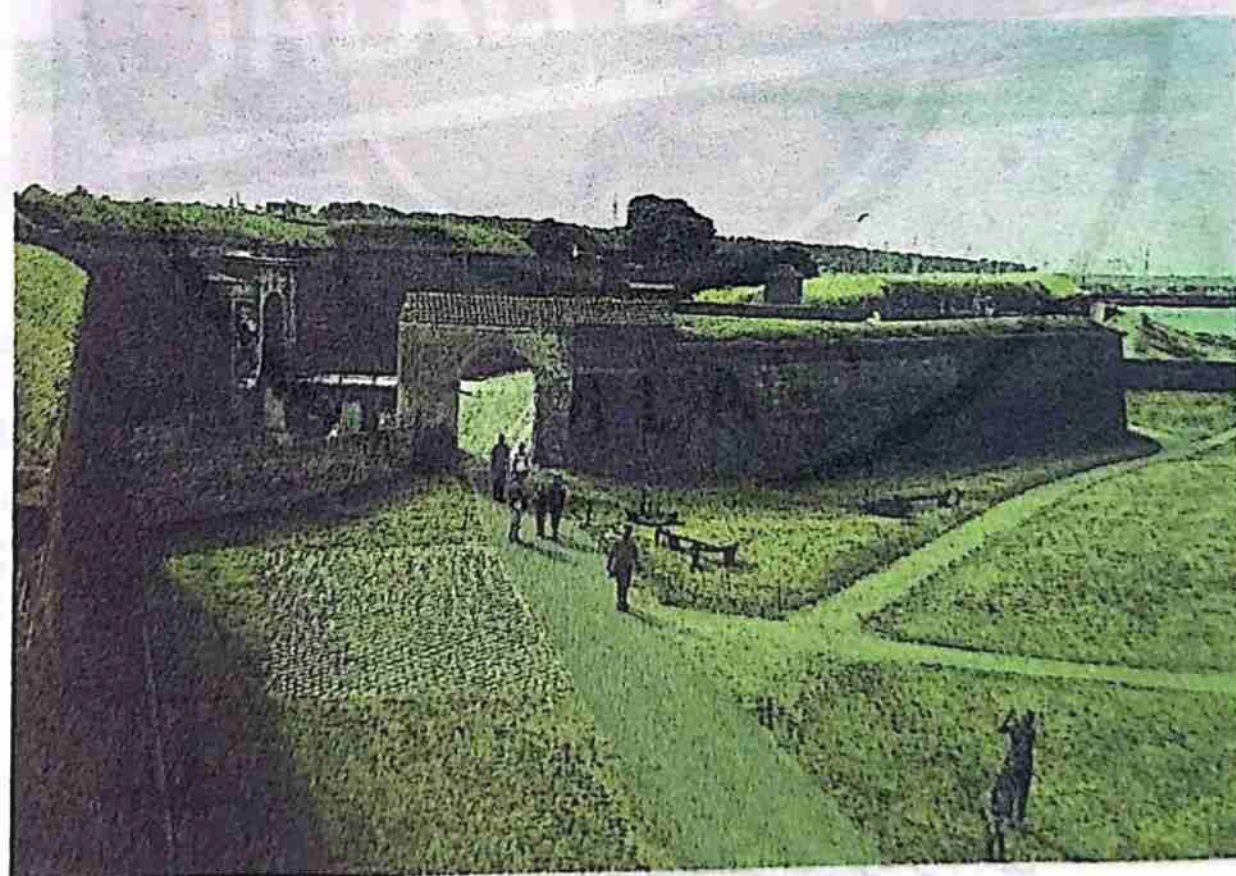
ہیلسنگور قلعہ کی شاہی نشست گاہ (۱)

مالمو میں طرزِ زندگی کا عمومی مشاہدہ

عید کے بعد عماد نے بھی دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کی چھٹیاں ابھی اٹھارہ اگست تک باقی تھیں، مگر اب ان کے پاس دادو رہنے کے لئے گئی تھیں۔ سو مریم اور عماد ان کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے اپنے آفس جانے لگے۔ مجھے پہلی دفعہ ان کے شب و روز کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ میں نے جانا کہ بچے اپنی عمر سے زیادہ ذمہ دار تھے۔ کبھی گندگی نہ پھیلاتے، اگر کچھ کھاتے تو ریپر ہمیشہ ڈسٹ بن میں ڈالتے۔ کھلونے کتابیں کپڑے اپنی جگہ پر رکھتے۔ طٰہٰ اپنے اور رجاء کے استعمال شدہ برتن سینک میں رکھنے کے بجائے ڈش واشر میں لگا دیتا۔ گیلے تولئے صوفے پر نہیں پھینکتے جوتے اور جرابیں بیڈ کے نیچے نہیں کھسکا دیتے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس عمر کے بچے جوتے کا تسمہ بھی خود نہیں باندھتے۔ بچوں کے کھانے کا ذوق بھی مغربی تھا۔ میش کئے ہوئے آلو، فنگر فش، پاستا، چکن نگٹس وغیرہ شوق سے کھاتے۔

میں نے مریم سے بچوں کی تعریف کی تو بہت خوش ہوئی۔

"ماما! یہ سب یہاں کی دوڑتی بھاگتی مصروف زندگی کا حصہ ہیں۔ یہاں ماں باپ دونوں جاب کرتے ہیں، ملازم دستیاب نہیں، دادا دادی، نانا نانی میسر نہیں تو بچوں کو شروع سے ہی ذمہ دار اور خود مختار بنایا جاتا ہے اور جب سکول کھلیں گے تو آپ رجاء کے ڈے کیئر جائیے گا۔ آپ دیکھیں گی کہ بچوں کو کس طرح خود انحصاری کی تربیت دی جاتی ہے۔

مالمو کی پیدل سیر

"طٰہٰ بیٹا! قریب میں کوئی پارک ہے تو ادھر چلیں"۔ میں نے مسلسل کارٹون دیکھتے

بچوں کوٹی وی سے دُور کرنے کی ترکیب سوچی۔

''جی دادو! نہر کے دوسری طرف ایکسر سائز گاتن میں بہت اچھا پارک ہے، ادھر

چلتے ہیں''۔ وہ جھٹ پٹ جوتے پہن کر تیار ہو گیا اور دو شاپر اُٹھا لئے۔

''اس میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ماما بچی ہوئی بریڈ اس میں ڈال دیتی ہیں، جو ہم سی گل (Seegulls)

(سمندری پرندوں) کو کھلا دیتے ہیں اور دوسرے میں ہمارے سوئمنگ ڈریسز ہیں۔ پارک

میں ایک چھوٹا سوئمنگ پول بھی ہے اور رجاء کو پرام میں لے کر چلیں گے۔ نیچے لفٹ کے

ساتھ ہی ایک روم میں سب کی پرام بھی رکھی ہیں''۔

نہر کنارے لکڑی کے بنچوں پر اکا دکا میلے کچیلے اونگھتے ہوئے ہوم لیس

(Homeless) بے گھر و بے در افراد براجمان تھے۔ کثیر تعداد میں سیگلو بھی دکھائی

دیئے۔ بچے کنارے پر لگے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر مٹھی بھر بریڈ کے ٹکڑے نہر میں

اچھال دیتے اور سی گلز ان کو جھپٹنے کے لئے پانی میں غوطہ لگاتے۔ بچے اس دلچسپ منظر سے

لطف اندوز ہوتے رہے۔ بطخوں کا ایک جوڑا دور سے قیں قیں کرتا تیزی سے تیرتا ہوا آرہا

تھا۔ ان کو لنگر بانٹے جانے کی اطلاع غالباً دیر سے ملی تھی۔

چمکتے دھوپ بھرے دن سے لطف اندوز ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد پارک

میں موجود تھی۔ ساکنان یورپ ایسا کوئی دن گھر بیٹھ کر ضائع نہیں کرتے۔

بچوں نے اپنے تیراکی کے لباس پہنے اور پانی میں اتر گئے، کم گہرائی کا سوئمنگ

پول غالباً بچوں کے لئے مخصوص تھا۔ بالوں کو سکارف سے ڈھانپے عرب خواتین بھی بچوں

کے ساتھ نظر آئیں۔ مالمو کی 40 فیصد آبادی غیر مقامی لوگوں پر مشتمل ہے، جن میں زیادہ

تعداد سیاسی پناہ گزینوں کی ہے جو پچھلے پچیس سالوں میں بوسنیا، عراق، ایران اور افغانستان سے یہاں منتقل ہوئے اور ان کی اگلی نسل ادھر ہی جوان ہوئی اور اب ان کی تیسری نسل یہاں پیدا ہو رہی ہے، جن کو بڑے ہونے پر شاید اپنے اصلی وطن کے بارے میں علم بھی نہ ہو۔ کچھ ایسے پاکستانی بھی یہاں مقیم ہیں جو کوپن ہیگن میں ملازمت کرتے ہیں اور نسبتاً سستی رہائشی سہولتوں کی وجہ سے مالمو میں مقیم ہیں۔

دونوں میاں بیوی پانچ بجے گھر لوٹے۔ مریم گھر آتے ہی کپڑے اُٹھا کر نیچے لانڈری کرنے چلی گئی۔ عماد نے ویکیوم کلینر لگا کر گھر کی صفائی کی۔ لانڈری کے بعد کچن کی مصروفیت طٰہٰ کا ہوم ورک اور اگلے دن کی تیاری۔ چھ بجے لاہور کے ایک قاری صاحب طٰہٰ کو سکائپ پر قرآن پاک پڑھاتے، اذان نماز اور چھوٹی چھوٹی سورتیں حفظ کرواتے۔ آسان دینی مسائل بتاتے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میرے بچے اولاد کی دینی تربیت سے غافل نہ تھے، لیکن اس بے تحاشا مصروفیت کو دیکھ کر مجھے تو جیسے خفقان ہونے لگا۔

اگلے دن میں نے ان کے آنے سے پہلے صفائی کر کے کھانا بنا لیا تھا۔ وہ بہت بگڑے کہ ایسا مت کریں، آپ یہاں کام کرنے نہیں بلکہ تفریح کرنے آئی ہیں۔ ہماری عادتیں خراب ہو جائیں گی، وغیرہ وغیرہ۔

''بکو مت، تم دونوں''۔ میں نے ان کو ڈانٹ دیا۔ ''آتے ہی کام میں جت جاتے ہو۔ میں تھوڑا کام کر لوں گی تو ہمیں مل بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔ یہاں ساڑھے نو بجے تک دن ہوتا ہے۔ ہم لوگ شہر گھومنے نکلا کریں گے''۔ بمشکل وہ راضی ہوئے۔

شہر کا مرکزی سکوائر یا چوک ''ستورتوریا'' (Stortorget) ہماری رہائش گاہ

سے تقریباً 10 منٹ کی واک پر تھا، اکثر ہم چلتے چلتے وہاں پہنچ جاتے۔ یہ پرانی تاریخی عمارتوں سے گھرا قدیم ترین سکوائر ہے جو 1536ء میں تعمیر کیا گیا۔ سٹی ہال کی قدیم عمارت کے سامنے ایک بلند چبوترے پر کنگ کارل گستاف کا گھڑسوار مجسمہ نصب ہے جس نے جنوبی صوبہ سکونے کو (جہاں مالمو واقع ہے) ڈنمارک کے تسلط سے آزاد کرایا تھا۔ تمام عمارتیں قدیم طرزِ تعمیر کی حامل ہیں، جن میں اب زیادہ تر کیفے بار اور ریسٹورنٹ قائم ہیں۔ اکثر کے سامنے چھتریاں لگا کر نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایک اچھی شام گزارنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ سکوائر میں ہر قسم کی ٹریفک کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس سے ذرا آگے شہر کا دوسرا قدیم سکوائر لیلا توریا (Lella Trorg... Little Square) واقع ہے۔ یہ 1592ء میں تعمیر کیا گیا۔ پرانی وضع کی لکڑی کی عمارتیں اور شاید سو سال پرانا ایک ٹیلی فون بوتھ عجیب سی سحر انگیز رومانویت لئے ہوئے ہیں۔ سکوائر میں لگا ہوا بڑا سا ٹیبل لیمپ سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا محور ہے۔

نیا معمول سب کو پسند آیا۔ پیدل گھوم کر شہر کو دیکھنا گاڑی میں گھومنے سے کہیں زیادہ پُرلطف اور معلومات افزا لگا۔ ایک دن ہم اپنی رہائش گاہ کے سامنے واقع نہر کے ساتھ ساتھ چلتے دائیں گھوم گئے۔ یہ علاقہ سودرہ پرایناڈن کہلاتا ہے۔

"یہ ہوم لیس شیلٹر ہے"۔ یعنی بے گھر و بے در لوگوں کی سرکاری پناہ گاہ۔ مریم نے ایک عمارت کی جانب اشارہ کیا۔ "نہر کنارے جو آوارہ گرد آپ کو نظر آتے ہیں وہ یہیں رہائش پذیر ہیں"۔

ہم چلتے چلتے نہر کے چوڑے پل پر پہنچ گئے۔ سڑک کے کنارے سبزہ زار پر ایک سویڈش بڑی بی کے کھوکھے سے آئس کریم لے کر پل کے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ نہر میں کئی جوڑے پیڈل والی رنگ برنگی کشتیاں چلا رہے تھے۔ مریم کوئی پرانی بات یاد کر کے

زور سے ہنس دی۔

''پتا ہے ماما! جب ہم نئے نئے اس شہر میں آئے تھے تو ایک دن ہم نے کشتی کرائے پر لی اور نہر میں چلانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے لگا کہ پیڈل بہت بھاری ہو گئے ہیں۔ میرا بہت زور لگ رہا تھا، دس منٹ میں سانس پھول گیا اور ٹانگیں درد کرنے لگیں۔ جب میں نے عماد سے شکایت کی کہ پیڈل بہت بھاری ہیں، آپ کو محسوس نہیں ہوا تو عماد نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''اچھا، مجھے تو پتہ نہیں میں تو پیڈل چلا ہی نہیں رہا''۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میں اکیلے ہی پچھلے دس منٹ سے خود کو اور عماد کو ڈھو رہی تھی''۔ ہم سب مسکرانے لگے۔

''مریم! یہ جھنڈا کتنا کلرفل ہے'' میں نے شوخ رنگوں کی پٹیوں پر مشتمل ایک رنگ برنگے جھنڈے کو دیکھتے ہوئے کہا جو ایک بلند عمارت پر لہرا رہا تھا۔ ''ہمارے ہاں ایک ٹی وی چینل کا لوگو بھی کچھ ایسا ہی ہے نا؟''

مریم اور عماد نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر کھی کھی کرنے لگے۔

''ہنسنے کی کیا بات ہے، میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے کیا؟''

''میری بھولی ماما!'' مریم نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہم جنس پرستوں کا جھنڈا ہے اور یہ بلڈنگ ان کا کلب ہے''۔

''لاحول ولا قوۃ...... چلو دفع کرو''۔ میں بُری طرح کھسیا گئی، نوچنے کو کوئی کھمبا بھی تو نہ تھا۔

◆◆◆

مالمو کے میلے

میں میلوں ٹھیلوں کی کبھی شوقین نہیں رہی۔

بچپن میں ایک دفعہ میں میلے میں کھو گئی تھی۔ گلی میں کچھ لوگ آئے تھے، ڈھول تاشے بجاتے، ناچتے اور رنگ برنگے جھنڈے لہراتے ہوئے لوگ۔ میں چھ سال کی بچی ہاڑ کی جلتی بلتی دوپہر میں گرمی سے بیزار کھڑکی کی سلاخیں تھامے باہر گلی میں جھانک رہی تھی۔ ماں کی نظر بچا کر باہر جو نکلی تو ان ناچتے ڈھول بجاتے لوگوں کے ساتھ چلتے چلتے ایک کھلے میدان میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں میری بیزاری دُور کرنے کو بہت کچھ تھا۔ تنی ہوئی رسی پر چلنے اور ایک پہیئے کی سائیکل چلانے والے بازیگر، طرح طرح کے جھولے، رنگ برنگی مٹھائیاں، مٹی، کاغذ اور تنکوں سے بنے ہوئے رنگ برنگے کھلونے، شعبدے باز جو رومال کو کبوتر بنا دیتے۔ میں ایک ایک چیز کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ مجھے کوئی بھی یاد نہ آ رہا تھا، اماں نہ ابا، نہ بھائی بہن، شاید میں میلے میں کھو گئی تھی یا میلے نے مجھے اپنے اندر گم کر لیا تھا۔ اچانک کسی نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"اری تُو یہاں پھر رہی ہے، اُدھر تیری ماں کا رو رو کر بُرا حال ہے"۔ وہ ایک

ہمسائی خالہ تھی جو مجھے کھینچتے ہوئے گھر لے آئی۔ محلے دار عورتوں کے جمگھٹے میں بیٹھی روتی ہوئی میری ماں مجھ پر جھپٹ پڑی اور ایک چانٹا رسید کرتے ہوئے بولی۔ ''کہاں دفعان ہوگئی تھی تُو!'' اور پھر مجھے اپنے ساتھ بھینچ کر ہچکیاں لینے لگی تھی۔

اور بس، مجھے میلے سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہوگئی۔ مگر یہ مالمو کا میلہ تھا اور بچے مجھے لے جانے پر بضد تھے۔ اگست میں منعقد کیا جانے والا یہ فیسٹیول سکنڈے نیویا کا سب سے بڑا فیسٹیول ہے جو ایک ہفتہ جاری رہتا ہے۔ جس میں میوزک، ڈرامے، تصویری نمائش، چٹپٹے کھابوں کی دکانیں، بچوں کی دلچسپی کی چیزیں اور جانے کیا کیا شامل ہوتا ہے۔ ان دنوں شہر میں چہل پہل ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر گاڑیوں کا رش بڑھ گیا تھا۔ شہر کے تمام ہوٹل بک تھے۔ مالموفیسٹیول میں شرکت کے لئے دوسرے یورپی ممالک سے بھی لوگ آتے ہیں۔ ایڈوولف سکوائر سے لیلاتوریا اور ستورتوریا تک کا سارا علاقہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔

ستورتوریا جہاں میوزک کنسرٹ منعقد کیا جارہا تھا، وہاں گاڑی لے جانے کا کوئی حال نہ تھا۔ ہر طرف پارکنگ فل تھی۔ گاڑیاں ہمارے اپارٹمنٹ کے سامنے تک پارک کی گئی تھیں۔ ہم چند منٹ کی پیدل واک کے بعد کنسرٹ کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ ایک اوپن ایئر کنسرٹ تھا۔ کارل گستاف وہم کے گھڑ سوار مجسمے کے سامنے رنگوں اور روشنیوں سے سجے ہوئے سٹیج پر کئی سازوں کے جلو میں ایک مغنیہ نغمہ سرا تھی۔ سازوں کی دُھن اور نغمے کے بولوں پر نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے ''ٹیٹو زدہ'' بازو لہراتے اور قدم تھرکاتے تھے۔ غیر مانوس زبان کے بولوں اور بدیشی موسیقی کے سبب مجھے نغمے میں کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی تھی۔ ہمارے قریب ہی زمین پر گرے ہوئے ایک شخص کو دو پیرامیڈک (Paramedics)

طبی امداد دے رہے تھے۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' میں نے عماد سے پوچھا۔

''پتہ نہیں، شاید نشے کی زیادتی سے بے ہوش ہوگیا ہے۔ عام سی بات ہے''۔ عماد نے لاپروائی سے کندھے اُچکا دیئے۔

ہم لوگوں کے ہجوم سے راستہ بناتے ستورتوریا سے باہر نکل آئے۔ بھنے ہوئے باداموں کی مہک فضا میں پھیلی تھی۔ عماد نے ایک ٹھیلے سے چینی کے ساتھ بھنے ہوئے بادام خریدے۔ ہلکے خنک موسم میں گرما گرم میٹھے باداموں نے خوب مزہ دیا۔ روایتی عرب کھانوں کے سٹالز پر عرب مرد وخواتین ہجوم کیے ہوئے تھے۔ عرب خواتین بہت خوبصورت انداز میں سر پر حجاب پہنتی ہیں، لیکن بعض خواتین کا حجاب کے ساتھ چست جینز ٹی شرٹ پہننا اور میک اپ سے چہرہ پوتنا میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔

سبھی کچھ تو تھا اس میلے میں...... جو بچپن میں لاہوری شاہ کے میلے میں دیکھا تھا۔ کہیں بازیگر رسیوں سے جھولتے تھے۔ کہیں بچوں اور بڑوں کے لئے جھولے لگے تھے، جن کو اب رائڈز (Rides) کہا جاتا ہے۔ کہیں کھانے پینے کی اشیاء کی اشتہا انگیز خوشبوئیں تھیں، لیکن اب ہم میلے میں گم نہ ہوتے تھے اور نہ میلہ ہمیں اپنے اندر سموتا تھا۔ لاہوری شاہ کے میلے اور مالمو کے میلے کے بیچ چار دہائیوں سے زیادہ کا زمانی عرصہ اور چار ہزار میل کا مکانی فاصلہ حائل تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی اور پاکستانی شباہت کا ایک چالیس پینتالیس سالہ مرد شلجم ایسی پھیکی رنگت اور مکئی کے بھٹے ایسے بالوں والی لڑکی کا عریاں بازو تھامے ہم سے نظر چراتا تیزی سے گزر گیا۔

''سرفراز......'' مریم نے چلتے چلتے رُک کر جیسے خود کلامی کی اور پھر عماد سے پوچھنے

لگی۔ ''سرفراز ہی تھا ناں یہ؟''

''ہاں، وہی تھا''۔ عماد نے تصدیق کی۔

''یہ ذرا میری آئس کریم پکڑیں میں عزت افزائی تو کر کے آؤں، مولوی صاحب کی''۔ مریم جیسے بھڑک اٹھی تھی۔

''ایسا کوئی ایڈونچر نہیں کریں گی آپ''۔ عماد نے اس کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہ کروں؟'' مریم منافقت برداشت نہ کر پا رہی تھی۔ ''دفتر میں یہ مولوی صاحب ہمیں تبلیغ فرماتے رہتے ہیں۔ مسلمان عورت اور پردہ ان کا محبوب موضوع ہے۔ میں تو مناسب لباس ہی پہنتی ہوں، لیکن میری ایرانی کولیگ جو مغربی لباس پہنتی ہے، وہ بے چاری شرمندہ ہوتی رہتی ہے۔ حضرت کے اپنے کرتوت دیکھیں ذرا۔ آج میں سمجھی کہ پچھلے دس سال سے پاکستان کیوں نہیں گئے۔ اگر ماں باپ نے شادی کے بندھن میں باندھ کر بیوی ساتھ کر دی تو یہ عیاشیاں کہاں ملیں گی''۔

''کیا، دس سال سے پاکستان نہیں گیا''۔ میں سرفراز کی ماں کی جگہ خود کو تصور کر کے کانپ گئی۔ مجھے وہ میلے میں کھویا ہوا بچہ لگا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے جاؤں اور ''پوچھوں کیوں تم یہاں پھر رہے ہو اور ادھر تمہاری ماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا ہے''۔

کوپن ہیگن یاترا

دو دفعہ کوپن ہیگن سے ہو کر آ چکے تھے، مگر کوپن ہیگن کی باقاعدہ سیاحت ابھی نہ ہوئی تھی۔ پہلی دفعہ بیلسور سے واپسی پر براستہ کوپن ہیگن واپس آئے تھے۔ واکنگ سٹریٹ کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا بھی کھایا تھا، مگر کوپن ہیگن دیکھنا...... یہ کوئی دیکھنا

تو نہ ہوا۔

دوسری دفعہ کوپن ہیگن آنا تب ہوا جب میری کزن نازیہ کا فون آیا۔ ''اب گھر سے نکل ہی آئی ہو تو ملے بغیر مت چلے جانا''۔ اس محبت بھری دعوت کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت اور ناممکنات میں سے تھا۔

کوپن ہیگن کے نواحی قصبے ہوئے تاستروپ (Hoje Tastrup) میں واقع خوبصورت ولا نازیہ کے شوہر ثاقب بھائی نے خود ڈیزائن کیا اور اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا۔ ثاقب بھائی یونیورسٹی کے شعبہ تعمیرات سے وابستہ ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے سول انجینئر ہیں اور کوپن ہیگن کے سیاسی اور سماجی حلقوں کی معروف شخصیت ہیں۔ نازیہ کی ساس میری امی کی دور کی کزن ہیں۔ بڑی محبت سے گلے لگاتیں اور امی کا پوچھتی تھیں۔ ''کیسی ہے تمہاری ماں؟ اس سے ملے تو برسوں بیت گئے''۔

نازیہ اور ثاقب سے بھی میری ملاقات برسوں بعد ہوئی تھی۔ اس وقت کے گود کے بچے اب ماشاءاللہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور بیٹی ہائی سکول کی طالبہ تھی۔ اسلامی اور مشرقی روایات کی پاسداری کرنے والا وضع دار گھرانہ تھا۔ بچے گوڈنمارک میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے مگر پاکستان اس کی سانسوں میں بستا تھا۔

کوپن ہیگن کو سکنڈے نیویا میں وہی حیثیت حاصل ہے جو بقیہ یورپ میں پیرس کو ہے۔ آپ کوپن ہیگن کے پڑوس میں آئیں اور کوپن ہیگن کی سیاحت کئے بغیر چلے جائیں، اس سے بڑی بدذوقی ہو ہی نہیں سکتی۔ سیاحت سے میری مراد گاڑی میں بیٹھ کر شہر کا چکر لگانا نہیں ہے۔ اگر پیدل چل کر شہر کے گلی کوچوں کو کھوجا نہ جائے تو سیاحت کا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا۔

سو اس ویک اینڈ پر کوپن ہیگن دیکھنے بلکہ کھوجنے کا پروگرام بنالیا۔ مریم کو گھر کے کچھ ہفتہ وار کام مثلاً لانڈری گروسری وغیرہ کرنا تھیں، میں اور عماد گھر سے پیدل ہی مالمو سینٹرل سٹیشن کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک وسیع میدان میں مختلف اشیاء کے سٹالز لگے تھے، یعنی لنڈا بازار لگا تھا۔ کپڑے، برتن، بیڈ شیٹس، بچوں کے کھلونے، ڈیکوریشن پیسز، باورچی خانے میں استعمال ہنے والی مشینیں ...... مگر یہ سب کچھ استعمال شدہ تھا۔

''یہ فلی (Flea) مارکیٹ ہے''۔ عماد نے بتایا۔ ''لوگ اپنے گھروں کی استعمال شدہ اور غیر ضروری اشیاء یہاں فروخت کے لئے لے آتے ہیں''۔

''تو گویا یہ یہاں کا لنڈا بازار ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، کہہ سکتے ہیں''۔

مالمو کے قدیم مرکزی ریلوے سٹیشن کی عمارت کے پہلو میں نیا اور جدید سہولتوں سے آراستہ ریلوے سٹیشن حال ہی میں تعمیر کیا گیا ہے۔ ہم لوگ کوپن ہیگن جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے۔ کسی بھی علاقے کی عمومی طرزِ زندگی کا مشاہدہ کرنا ہو تو پبلک ٹرانسپورٹ سے سفر کریں، بہت سے پہلو سامنے آجائیں گے۔ یورپ کی دوڑتی بھاگتی مصروف زندگی کا صحیح معنوں میں ادراک ہوا، جب ٹرین میں ہی لوگوں کو ناشتا کرتے لیپ ٹاپ پر کام کرتے خواتین کو بال برش کرتے اور لپ سٹک لگاتے دیکھا۔ یہ عالم چھٹی کے دن کا تھا۔ عام دنوں میں کیا ہوگا۔ تمام تر تہذیب و اخلاقیات کے باوجود کسی بوڑھے یا خواتین کے لئے سیٹ چھوڑنے کا کوئی رواج نہیں۔ عماد نے بتایا کہ ایک دفعہ اس نے ایک حاملہ عورت کے لئے سیٹ خالی کی تھی تو کچھ لوگوں نے اس کو

یوں دیکھا جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔

کوپن ہیگن سینٹرل سٹیشن کی قدیم طرزِ تعمیر کی حامل عمارت تاریخی عمارتوں کا سا حسن لئے ہوئے تھی۔ پلیٹ فارم پر پرانے طرز کی سٹیم انجن والی ٹرین پُرشور آواز میں دھواں چھوڑتی روانگی کے لئے تیار کھڑی تھی۔ دیگر پلیٹ فارموں پر آتی جاتی جدید ریل گاڑیوں کے بیچ یہ ایک حیرت انگیز دلچسپ منظر تھا۔ عماد معلومات لینے گارڈ کی طرف بڑھا، جس نے بتایا کہ 100 سال پرانی ٹرین ٹورسٹوں کو شہر کا چکر لگوانے کے لئے لائی گئی ہے۔ یہ صرف چھٹی کے دن کے لئے ہے۔ اب یہ ٹرین دو گھنٹے کے بعد آئے گی۔ ہم لوگوں نے دو گھنٹے ریلوے سٹیشن پر گھوم پھر کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ شیشے کے ایک باکس میں شہر کا ماڈل بنا ہوا تھا۔ اس کی تصویریں کھینچتے رہے، ایک گول میز پر Tab خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ دو ڈینش لڑکیاں دلنواز مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہاتھوں میں رنگین کتابچے تھامے کھڑی تھیں۔ مجھے متوجہ پا کر عماد نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

''ادھر مت رُکئے گا! یہ کسی کمپنی کی پروموشن کے لئے ہے۔ یہاں رُک گئے تو یہ چرب زبان سیلز گرلز کچھ نہ کچھ خریدنے پر مجبور کر دیں گی''۔

دو گھنٹے کے بعد ٹرین آتی نظر آئی۔ ''ٹرین کتنی دیر پلیٹ فارم پر ٹھہرے گی؟'' عماد نے گارڈ سے پوچھا۔

''یہ تو اس کا آخری پھیرا تھا''۔ کیا معصومیت بھرا جواب تھا، مگر اس سادگی پر مر جانے کو نہیں مار دینے کو دل چاہتا تھا۔ گارڈ نے غالباً ہمارے تیور بھانپ لئے تھے۔ آپ لوگ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو ٹرین اندر سے دکھاتا ہوں''۔ وہ ہمیں ساتھ لئے ٹرین میں داخل ہو گیا، اندر ہماری دلچسپی کی کوئی خاص چیز نہ تھی۔ عام سی ٹرین تھی، جیسی ہمارے

ہاں اب تک ہوتی ہیں۔ ڈائننگ کار میں ملکہ اور ان کے شوہر کی تصویر آویزاں تھی۔ ڈینش زبان میں لکھا جو عماد کی سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ ملکہ اپنے شوہر کے ساتھ جون 2007ء میں یہاں تشریف لائی تھیں۔

ریلوے سٹیشن پر دو گھنٹے ضائع کرنے کا افسوس کرتے باہر نکلے۔ قریب ہی کوپن ہیگن کا مشہور زمانہ پارک ''توالی'' (Tivoli) تھا۔ ٹکٹ لینے والوں کی طویل قطار لگی تھی۔

''کیا خیال ہے ماما! توالی دیکھیں گی، لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں''۔ عماد مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''کتنا ٹائم لگے گا؟''

''آج کا دن تو توالی کے نام ہو جائے گا''۔

''رہنے دو''۔ میں نے کہا۔ ''آج ہم کوپن ہیگن گھومیں گے''۔

کوپن ہیگن میں سائیکل رکشہ

سٹی ہال (City Hall) کی مستطیل دریچوں اور مخروطی میناروں والی سرخ رنگ کی عمارت کی پیشانی پر آویزاں سنہری تختی پر انسانی شبیہ اُبھری تھی۔ یہ یسوع کی شبیہ تو نہیں لگتی۔ میں نے عماد سے پوچھا۔

''یہ بارہویں صدی کے آرچ بشپ، ابسالون'' (Absalon) کی شبیہ ہے۔ سامنے جو مجسمہ نصب ہے وہ بھی ابسالون کا ہی ہے۔ اس کا ڈنمارک کی سیاست میں بہت عمل دخل تھا۔ کوپن ہیگن کا شہر اسی نے بسایا تھا۔

سٹی ہال کی موجودہ عمارت 1905ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ میونسپل کونسل کا مرکزی دفتر ہے۔ اس دن غالباً کوئی شادی کی تقریب منعقد کی جا رہی تھی۔ کیونکہ عمارت کے

اندر باہر خاصی چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔شاید کسی کو عاشقی کو قید شریعت میں لانے کا خیال آگیا تھا۔

کوپن ہیگن بائیسیکل چلانے والوں کا شہر ہے۔ہر سُو مرد و زن بائیسیکل پر سوار آتے جاتے نظر آئیں گے۔ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم کے سائیکل سواروں کے بارے میں سنتے تھے، مگر کوپن ہیگن کو بچشم خود دیکھا۔سائیکل رکشہ اور وہ بھی کوپن ہیگن جیسے ترقی یافتہ شہر میں دیکھنا باعث حیرت لگا، جب کہ تیسری دنیا کے ممالک بھی اس پر پابندی لگا چکے ہیں اور انسانیت کی تذلیل پر لعنت بھیج چکے ہیں۔

سائیکل رکشہ کی سواری کا شوق تو پورا کر لیا، مگر ابھی بھی یہ سوچ کر شرمندہ ہو جاتی ہوں۔بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ ہم بڑے مزے سے سیٹ پر براجمان ہوں اور ایک انسان ہمیں ڈھو رہا ہو۔

وہ ایک اٹھارہ انیس سالہ مسکراتے چہرے والا سفید فام نوجوان تھا، جو ہمیں وائکنگ سٹریٹ کی متوازی سڑک سے نی ہاون (Nyhavan) تک ڈھوتے ہوئے لے جا رہا تھا۔

''آپ کب سے کوپن ہیگن میں ہیں؟'' پیڈلوں پر زور ڈالتے ہوئے وہ مڑ کر ہم سے مخاطب تھا۔

''یہی کوئی دو ڈھائی گھنٹے سے''۔عماد کے اس انوکھے جواب پر اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''میرا مطلب ہے آپ کب سے کوپن ہیگن میں رہ رہے ہیں؟'' اس نے اپنے سوال میں کچھ ترمیم کی۔

''بتایا تو ہے دوڈھائی گھنٹے سے۔ چلو دس پندرہ منٹ زیادہ سمجھ لو''۔ نوجوان جس کا چہرہ غالباً مشقت کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا، کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں سر ہلانے لگا۔ میں جو پہلے ہی شرمندہ سی ہو رہی تھی، عماد کو ڈانٹنے لگی۔

''کیوں الٹے جواب دے رہے ہو، بے چارے کو۔ دیکھتے نہیں غریب کی کیسے سانس پھول رہی ہے''۔

''جو پوچھ رہا ہے، وہی تو بتا رہا ہوں۔ الٹے جواب کب دے رہا ہوں''۔ عماد صاحب نے معصومیت کی کمال اداکاری کی۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو وہ کیا پوچھ رہا ہے، خواہ مخواہ مستی نہ کرو''۔

''میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ مالمو میں رہتا ہوں، سافٹ ویئر انجینئر ہوں، اپنی ماں کو کوپن ہیگن کی سیر کرانے لایا ہوں''۔ میرا بیٹا شرافت کے جامے میں آ گیا تھا۔

''اب ٹھیک ہے ماما؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ میں بھی مسکرا دی۔

''میں چیک ریپبلک سے ہوں۔ یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ چھٹی کے دن یہ کام کر لیتا ہوں''۔ نوجوان نے اپنے بارے میں بتایا۔

سائیکل رکشہ کوپن ہیگن کی عمومی سواری نہیں ہے۔ یہ صرف تفریحی مقامات پر سیاحوں کے لئے ہے۔ جیسے بگھی ہمارے ہاں عمومی سواری نہیں ہے۔ خاص مقامات پر تفریحی مقاصد کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

یورپی یونین کے تشکیل پانے کے بعد جب کہ یورپی ممالک نے آپس میں ویزے کی پابندی ختم کر دی ہے۔ معاشی طور پر کمزور یورپی ممالک مثلاً پولینڈ، بلغاریہ، رومانیہ، چیک ریپبلک، سلواکیہ وغیرہ سے بڑی تعداد میں لوگ معاشی طور پر خوشحال

ممالک کا رخ کرنے لگے ہیں، جہاں وہ تعلیم اور روزگار کے نسبتاً بہتر مواقع حاصل کر سکتے ہیں۔

بالٹک کے پانیوں میں ایک گھنٹہ

نوجوان نے ہمیں ''نی ہاون'' (Nyhavan) پر اتار دیا۔ نی ہاون انگریزی میں ''نیو ہاربر (New Harbour) ہے، یعنی نئی بندرگاہ مگر یہ قطعاً نیا علاقہ نہیں ہے۔ علاقے کے بیچوں بیچ بہتی نہر کے دونوں اطراف میں قدیم ٹاؤن ہاؤسز کی قطار ہے جو زیادہ تر سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں تعمیر ہوئے۔ یورپ اپنی قدیم تاریخی حیثیت پر نازاں ہے، یہاں تاریخ کو سینت کر رکھا جاتا ہے۔ پرانی عمارتوں کو مرمت اور تعمیر نو کے بعد ان کی اصل شکل میں بحال کر دیا جاتا ہے۔ اہل یورپ نے ثابت کر دیا ہے کہ شہروں کی قدیم حیثیت کو بحال رکھتے ہوئے بھی ان کو ترقی یافتہ بنایا جاسکتا ہے۔ قدامت اور جدت کا خوبصورت امتزاج سیاحوں کے لئے باعث کشش ہوتا ہے۔

نی ہاون کے بیچوں بیچ بہتی نہر کے دونوں کناروں پر کشادہ سڑکوں کے ساتھ ساتھ رنگ برنگے نارنجی سرخ نیلے پیلے ٹاؤن ہاؤسز میں سے بیشتر اب کیفے بارز یا ریستورانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جن کے باہر لگی ہوئی کرسیوں میزوں پر رنگین چھتریوں کے نیچے لوگ کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ نہر میں کشتیاں رواں تھیں جو سیاحوں کو ایک گھنٹے کا بوٹ ٹور (Boat Tour) کرواتی تھیں۔ میں نے کنارے پر کھڑے کھڑے جائزہ لیا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک کشتی میں لگ بھگ 150 لوگوں کے لئے نشستیں لگائی گئی تھیں۔ ماحول جو تھوڑی دیر پہلے تک روشن اور چمکدار تھا۔ آن کی آن میں سرمئی ہو چلا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور ہلکی بوندا باندی

شروع ہو چکی تھی۔ موسم کے پیش نظر عماد نے جس کشتی کا انتخاب کیا اس پر شفاف پلاسٹک کی پورٹیبل چھت لگی تھی۔

''موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں ہیں''۔ عماد کہہ رہا تھا۔ ''اس طرح بھیگنے سے تو بچے رہیں گے''۔

واقعی اس کی بات سچ ثابت ہوئی۔

نہر کے کنارے پر بنے ہوئے بوتھ سے ٹکٹ خریدا اور چند سیڑھیاں اتر کر کشتی میں بیٹھ گئے۔ دس منٹ کے اندر اندر تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔ ملاح نے انجن سٹارٹ کر کے رخ موڑا اور کشتی موجود سے کھیلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ خاتون گائیڈ نے مائیک سنبھالا اور عرشے پر کھڑی ہوگئی۔ وہ ہر فقرے کو تین زبانوں میں دہراتی تھی۔ انگریزی ڈینش اور تیسری غالباً جرمن زبان تھی۔

نہر کے ابتدائی حصے میں دائیں طرف سالخوردہ بحری جہازوں کی قطار تھی۔ نی ہاون کے پُل سے پہلے کا حصہ قدیم بحری جہازوں کا میوزیم ہے۔ گائیڈ مختصراً ان کی تاریخ کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''یہ آنا مولر (Anna Moller) ہے۔ 1906ء میں بنایا گیا''۔

''یہ لائٹ ویسل (Lightvessel) ہے۔ 1895ء میں بنا اور 1972ء تک کام کرتا رہا''۔

''یہ بوٹ تھیٹر (Boat theatre) ہے۔ اس کو 1898ء میں بنایا گیا اور 1972ء تک تھیٹر بوٹ کے طور پر فعال رہا''۔

''بائیں طرف سرخ اور پیلے گھروں کے بیچ سفید رنگ کا جو گھر دکھائی دیتا ہے

یہ ڈنمارک کے مشہور ادیب ہانز کرسچین اینڈرسن کا مکان ہے، جہاں وہ اٹھارہ سال تک مقیم رہا''۔

''یہ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت پرانی سٹاک ایکسچینج بلڈنگ ہے جو 1925ء میں کنگ کرسچین چہارم کے دور میں تعمیر کی گئی''۔

گائیڈ معلومات کے دریا بہا رہی تھی۔

کشتی پلوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ بعض پل اتنے نیچے تھے کہ خوف محسوس ہوتا تھا، کہیں ٹکرا نہ جائیں اور بعض اتنے تنگ کہ ہاتھ بڑھاؤ اور دیوار کو چھو لو۔ مگر ناخدا تھا کہ مہارت سے لئے جاتا تھا۔ پلوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے ہم نسبتاً کھلے سمندر میں پہنچ گئے تھے۔ سیویئر چرچ (Saviour Chruch) کا سیاہ رنگ کا پیچوں (Spiral) مینار جو سنہری دھاتی حاشیے سے سجا تھا بہت خوبصورت لگا۔ سیاح کشتی میں کھڑے ہو کر اس کی تصاویر کھینچتے تھے۔ نئے اوپیرا کی عمارت جدید اور منفرد طرزِ تعمیر کی حامل تھی، جس کا افتتاح 2005ء میں ہوا تھا۔ شاہی محل پر پرچم لہرا رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ ملکہ عالیہ محل میں تشریف فرما ہیں۔

سب سے زیادہ انفرادیت کی حامل عمارت بلیک ڈائمنڈ لائبریری کی تھی۔ شیشے کی دیواروں میں سامنے سے گزرتی کشتی کا عکس دکھائی دیتا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کشتی عمارت کے اندر سے گزرتی ہو۔ سیاح اس انوکھے منظر کو کیمروں میں قید کر رہے تھے۔ سمندر کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی سیاہ رنگ کی ننھی جل پری (جو ہانز کرسچین اینڈرسن کی کہانی کا ایک مشہور کردار ہے) کے مجسمے کی ہم صرف پشت ہی دیکھ سکے۔ مجھے اس میں کوئی خاص بات دکھائی نہ دی، لیکن ہو سکتا ہے قریب سے دیکھنے میں کچھ خاص ہو۔ آخر لوگ یونہی

تو دُور دُور سے ننھی جل پری کی ملاقات کو نہیں آتے۔

اس جدید سائنسی دور میں جب کہ جام جم کمپیوٹر سکرین کی شکل میں بچے بچے کے ہاتھوں میں آچکا ہے۔کوئی بھی منظر نیا نہیں لگتا۔سب کچھ دیکھا بھالا سا معلوم ہوتا ہے۔مگر جب آپ سکرین پر دیکھے ہوئے کسی منظر کا حصہ بن جاتے ہیں تو احساسات کی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔اس دن بالٹک کے سرمئی پانیوں کے اوپر اور سرمئی بادلوں کے نیچے سفر کرتے ہوئے جو منفرد سا احساس رگ و پے میں لہریں لیتا تھا وہ ان مناظر کو سکرین پر دیکھنے سے کبھی پیدا نہیں ہوتا۔کشتی نے ٹور مکمل کرنے کے بعد ہمیں وہیں اتار دیا جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ہم لوگ کشتی سے نکلے اور سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آ گئے۔

''کمال کا ٹور تھا اور بے حد معلوماتی بھی''۔میں نے عماد سے کہا۔''لگ رہا تھا جیسے کالج کی طرف سے کسی معلوماتی دورے پر نکلے ہوئے ہیں''۔

''اور ایک بات جو انہوں نے آپ کو نہیں بتائی وہ میں بتاتا ہوں''۔عماد کہہ رہا تھا۔''نی ہاون کی بندرگاہ ان سویڈش جنگی قیدیوں سے تعمیر کرائی گئی تھی جو 1658ء کی جنگ میں ڈنمارک کے ہاتھ آئے تھے۔

سٹروگے (Stroget) واکنگ سٹریٹ

نی ہاون سے ہم نے واکنگ سٹریٹ (پیدل مٹر گشت والی گلی) کا رخ کر لیا۔آج کے دن آوارہ گردی ہی مقصد ٹھہرا تو پھر کہیں رُکنے سے فائدہ؟ ''شالا مسافر کوئی نہ تھیوے......'' مگر ہم تو برضا و رغبت مسافرت میں تھے۔

کوپن ہیگن کی واکنگ سٹریٹ جو مقامی زبان میں سٹروگے (Stroget) کہلاتی ہے، یورپ کی طویل ترین واکنگ سٹریٹ اور خرید و فروخت کا بڑا مرکز ہے۔دنیا بھر

کے بڑے بڑے برانڈز مثلاً کوچی، میکس مارا، پراڈا، ملبری جو فیشن کی دنیا میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں، انہوں نے اپنے سٹور یہاں کھول رکھے ہیں۔

اس دکان کا نام غالباً ''ہاؤس آف امبر'' (House of Amber) تھا، جس کے شوکیسوں میں زردی مائل اور سرخی مائل بھورے پتھروں سے بنے نفیس زیورات سجے تھے۔ لعل، یاقوت، نیلم، زمرد وغیرہ کے انگریزی نام تو معلوم تھے، امبر کس پتھر کا انگریزی نام ہے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ دکان کے اندر داخل ہو کر زیورات دیکھنے لگے۔ قیمتیں کچھ زیادہ لگیں۔ کوپن ہیگن ویسے بھی مہنگا شہر ہے۔ ایک باریک سی لڑی پر مشتمل بریسلٹ کی قیمت 700 ڈینش کرونا تھی۔

''ماما! کچھ لے لیں''۔ عماد بار بار کہہ رہا تھا، مجھے کچھ خریدنا نہیں تھا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ ''امبر'' (Amber) کیا ہے۔ سیلز گرل نے ایک چھوٹا سا کتابچہ ہمارے حوالے کیا جس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ''امبر'' کوئی پتھر نہیں ہے بلکہ کسی درخت کا گوند ہے جو پتھر کی طرح سخت ہوتا ہے۔

''ستروگے'' پر ہر وقت میلے کا سماں رہتا ہے۔ گیندوں کے ساتھ طرح طرح کے کرتب دکھاتے مداری، ساز بجاتے موسیقار، ایک شخص سکیٹ بورڈ پر کرتب دکھا رہا تھا۔ ان کے قریب بچھے ہوئے رومالوں پر لوگ سکے ڈالتے تھے۔ یہ وہ بھکاری تھے جو لوگوں کو محظوظ کر کے کمائی کرتے تھے۔

ایک منظر مجھے بہت دلچسپ لگا۔ ہرے پیلے کالے رنگوں کے کھلے سے لبادے میں ایک شخص زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ دوسرا بالکل اسی طرح کے لباس میں آلتی پالتی مارے اس کے سر سے دو فٹ اوپر ہوا میں معلق تھا۔ دونوں کے بیچ میں ایک لاٹھی تھی،

مصنفہ کوپن ہیگن ریلوے سٹیشن پر

سٹروگے کے مداری
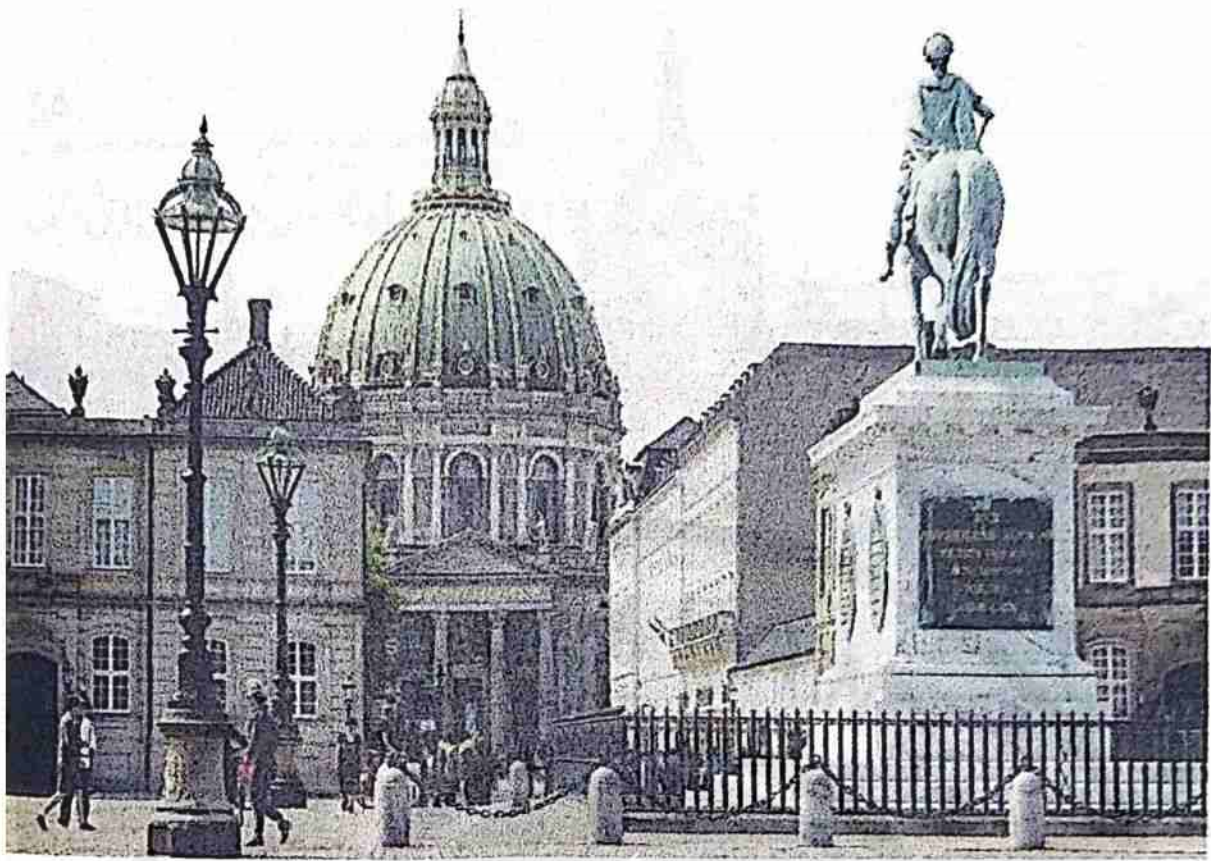
کوپن ہیگن کا شاہی محل
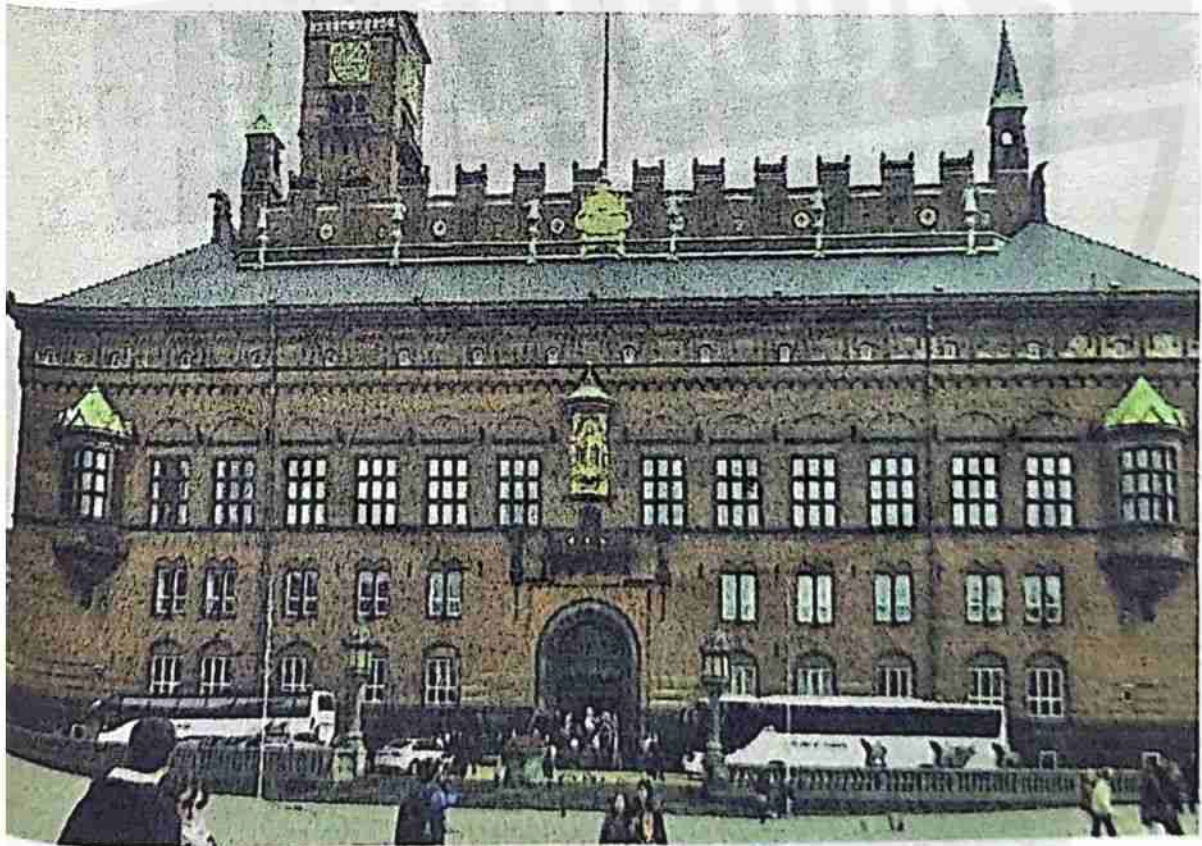
سٹی ہال۔۔ کوپن ہیگن

جس کا نچلا سرا نیچے والے اور دوسرا اوپر والے شخص نے تھام رکھا تھا۔ دونوں کسی تصویر کی مانند بے حس و حرکت تھے۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "ماما! یہ سب ایک دھاتی سٹینڈ کے ذریعے کیا جاتا ہے، جوان کے بھاری لبادوں کے اندر چھپا ہوا ہے"۔ گھر جا کر عماد نے سٹینڈ کا نقشہ سمجھایا تو بات سمجھ آئی۔

اب ہمیں سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میکڈونلڈ کا فش برگر واحد خوراک تھی جو شک و شبہ سے بالاتر ہو کر کھائی جا سکتی تھی۔ مگر برگر کھانے کا بالکل موڈ نہ تھا۔ میکڈونلڈ کے سامنے "گرل ہاؤس" نامی عربی ریسٹورنٹ تھا۔ ہم نے اس کی اوپری منزل پر جا کر کھڑکی کے پاس والی میز سنبھال لی۔ ہم نے اپنے لئے شیش توک آرڈر کیے۔ ریسٹورنٹ کا اندرونی ماحول دیسی سا دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ باہر بھی مجھے کچھ دیسی ہی لگا۔ بالکل سامنے میکڈونلڈ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے الجھے ہوئے سفید بالوں اور بے ترتیب داڑھی والا بھکاری بیٹھا تھا۔ دکانوں کے آگے فٹ پاتھ پر ملبوسات کے ہینگر آویزاں تھے۔ جن کو دیکھ کر اپنے ہاں کی انارکلی مارکیٹ یاد آتی تھی۔ گھر جا کر جب میں نے یہی بات مریم سے کہی تو اس نے میرے خیال سے شدید اختلاف کیا۔

"انارکلی کیونکر لگی وہ آپ کو کیا وہاں شور مچاتی موٹر سائیکلیں، رکشے، سڑکوں پر پڑے چھلکے، گتے کے ڈبے اور اڑتے ہوئے شاپر نظر آئے تھے؟" لہٰذا مجھے اپنے خیال پر شرمندگی اُٹھانی پڑی۔

سڑک پر چلتے چلتے کچھ لوگ اچانک سڑک پر لیٹ جاتے اور دو چار منٹ کے بعد اُٹھ کر چلنے لگتے۔ عماد نے بتایا کہ یہ کوئی علامتی احتجاج ہو رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ

احتجاج غزہ پر اسرائیلی جارحیت کے خلاف تھا۔ مجھے اپنے ہاں کے احتجاج یاد آ گئے۔ گاڑیوں کو توڑ دو۔ دکانوں کو آگ لگا دو، سڑکوں پر ٹائر جلا کر آلودگی پیدا کرو، جبھی تو باطل کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوگا اور صیہونی طاقتیں فلسطین کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گی۔

ویٹرس نے کھانا میز پر رکھ دیا تھا۔ دو بڑی پلیٹوں میں شیش توک، ڈھیر سارے فرائز، سلاد، چٹنیاں وغیرہ۔

''عماد یہ تو بہت زیادہ کھانا ہے''۔ میں نے اتنا کچھ دیکھ کر کہا۔ ''ہمیں ایک ہی سرونگ منگوانی چاہیے تھی''۔

''ماما! عرب ہوٹلوں کی سرونگ عام طور پر زیادہ ہی ہوتی ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں، آپ کا بیٹا ان شاء اللہ پلیٹیں صاف کر کے ہی جائے گا''۔ (دھو کر نہیں، کھا کر، پیٹو کہیں گا)۔

قریۂ شاہاں کی سیر

یورپی اقوام نے جب بادشاہت کے کہنہ نظام کو خیر باد کہہ کر سلطانی جمہور کو خوش آمدید کہا تو شاہی خاندان کو غالباً تاریخی ورثے کے طور پر سنبھال کر رکھ دیا۔ یہاں شاہی خاندان کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں وہ محض پارلیمنٹ کے وظیفہ خوار کے طور پر زندگی بسر کرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی ان کو پارلیمنٹ سے عرضی گزارنی پڑتی ہے کہ صاحب اس وظیفے میں گزارہ نہیں ہوتا۔ بندہ پروری فرمایئے اور خرچہ کچھ بڑھا دیجئے۔ جس پر پارلیمنٹ کے اجلاس میں غور وخوض ہوتا ہے، کبھی تو منظوری ہو جاتی ہے اور کبھی ٹکا سا جواب دے دیا جاتا ہے کہ ظل سبحانی، یہ عوام کے ٹیکسوں کا پیسہ ہے اور انہی کا حق فائق ہے، آپ اسی وظیفے میں گزارہ فرمائیں اور دال روٹی کھائیں۔

کھانے سے فراغت پائی۔ پیٹ پوجا ہو چکی تو دوجا کام کرنے کو نکل کھڑے ہوئے، یعنی کوچۂ شاہاں کے نیاز حاصل کرنے چلے۔ شاہی محلات سے ذرا پہلے فریڈرک چرچ کی پُرشکوہ عمارت تھی جو اپنی سنگی دیواروں کی وجہ سے ماربل چرچ بھی کہلاتی ہے۔ اس گرجا گھر کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لگ بھگ ایک سو پچاس سال میں مکمل ہوا۔ فریڈرک پنجم نے 1749ء میں اس کی بنیاد رکھی، لیکن رقم کی کمی اور آرکیٹکٹ کی وفات کی وجہ سے ادھورا چھوڑ دیا گیا۔ 1874ء میں اس کی تعمیر دوبارہ شروع ہوئی اور بیس سال بعد 1894ء میں مکمل ہوئی۔ شاہی محل جس کو ایمالیئبورک (Amalionborg) بھی کہا جاتا ہے۔ چار عمارات پر مشتمل ہے جن کے بیچوں بیچ فریڈرک پنجم کا مجسمہ نصب ہے۔ ہر روز دوپہر بارہ بجے گارڈ کی تبدیلی عمل میں آتی ہے۔ مخصوص وردیوں میں ملبوس اور سروں پر بھالو کی کھال کی بڑی بڑی ٹوپیاں پہنے محل کے محافظ دستے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اس دلچسپ منظر کو ہم دیکھ نہ پائے، جس کو لوگ خاص طور پر دیکھنے آتے ہیں۔ ان بادشاہوں اور ملکاؤں پر بہت ترس آیا جن کے محلات کے باہر نہ کوئی رکاوٹ کھڑی ہوتی ہے نہ محافظ روکتے ہیں۔ عوام الناس یہاں سے دندناتے ہوئے گزر جاتے ہیں، جس کا جی چاہے آئے تصویریں کھینچے گھومے پھرے مزے کرے۔

فریڈرک چرچ سے امالیئبورگ جانے والی سڑک پر بنی عمارتوں پر مختلف ممالک کے پرچم لہرا رہے تھے۔ یہ غالباً سفارت خانے تھے۔ پاکستانی پرچم دکھائی نہ دیا، کیونکہ پاکستانی سفارت خانہ یہاں سے کچھ دور ہلارپ (Hallarup) کے مقام پر ہے۔

میں کبھی زندگی میں اتنا پیدل نہ چلی تھی جتنا اس روز چلنا پڑا۔ تھکن سے بُرا حال تھا۔ مالمو سینٹرل سٹیشن سے باہر نکل کر میں ایک بینچ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

''میں اب ایک قدم بھی پیدل نہیں چل سکتی''۔میں نے عماد کو الٹی میٹم دیا۔''ٹیکسی منگواؤ یا اُٹھا کر گھر لے چلو Choice is yours'' جیسے تمہاری مرضی۔

''میرے پاس ایک تیسرا آپشن بھی ہے''۔عماد نے کہا،''جس جگہ آپ تشریف فرما ہیں، یہ بس سٹاپ ہے۔ابھی بس آئے گی ہمیں سیدھا گھر کے سامنے اُتار دے گی۔امید ہے کہ بس کے اندر قدم رنجہ فرمانے کے لئے پاؤں کو تھوڑی زحمت دے لیں گی''۔

گھر پہنچ کر تھکن سے چُور ہونے کے باوجود نصیر صاحب کو تصویریں Whatsapp کیں۔ان کا فون آیا تو خوش وخروش سے دن بھر کی روداد سنائی۔کچھ تصویریں منتخب کر کے فیس بک پر لگائیں اور سٹیٹس لکھا۔''آج کوپن ہیگن کی گلیوں میں آوارہ گردی کی۔بہت مزا آیا''۔بے تحاشا تھکن کا کوئی ذکر نہ کیا۔کہیں لوگ بڑھیا نہ سمجھنے لگیں۔

مسلمان مالمو(Rosangard)

عماد نے کہا تھا اگر آپ سچ مچ کا مسلمان مالمو دیکھنا چاہتی ہیں تو کسی دن روزن گارڈ (Rosangard) لے چلوں گا۔ سو آج ہم روزن گارڈ کی طرف محوِ سفر تھے جو ہماری رہائش گاہ سے زیادہ دُور نہ تھا۔

یوں تو یہاں کچھ بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ سٹاک ہوم اور یوتے برگ کے بعد مالمو سویڈن کا تیسرا بڑا شہر ہے، مگر دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو میں ہی شہر "مک" جاتا ہے۔

مالمو کی مرکزی مسجد سے ذرا آگے جس پل کے نیچے سے گزر کر ہم روزن گارڈ میں داخل ہوئے اس کی پیشانی پر جلی حروف میں (Rosengard) کے الفاظ تحریر تھے، ساتھ میں سویڈش زبان میں کوئی فقرہ لکھا تھا، جس کے نیچے (Citat Zalatan) تحریر ہونے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ زلاتن ابراہیموو چ کا کوئی قول ہوگا اور ایسا ہی تھا۔ سویڈش زبان میں لکھے گئے اس فقرے کا ترجمہ جو عماد نے بتایا وہ کچھ یوں تھا۔ "آپ روزن گارڈ سے کسی کو لے جاسکتے ہیں، مگر کسی سے روزن گارڈ نہیں لے سکتے"۔

ابتدائی طور پر روزن گارڈ ان مزدوروں کا علاقہ تھا جو اِردگرد کے دیہات سے کام حاصل کرنے مالمو آتے تھے۔ بعد میں جب بوسنیائی، عراقی، شامی، افغانی، ایرانی تارکین وطن اور مہاجرین نے سویڈن کا رُخ کیا تو ان کو اسی علاقے میں آباد کیا گیا۔

1972ء میں یہاں تارکین وطن کا تناسب اٹھارہ فیصد تھا جو اب چھیاسی فیصد ہے۔

یہاں میں انتہائی دُکھ سے یہ بات کہنا چاہوں گی کہ عصر حاضر میں مسلمان معاشرے مجموعی طور پر انحطاط اور تنزل کا شکار ہیں۔ اس کی ایک جھلک روزن گاڈ میں بھی نظر آتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا تناسب انتہائی پست ہے۔ بے روزگاری کا تناسب زیادہ ہے۔ مہاجرین کی اکثریت کوئی کام کرنے کے بجائے حکومت کی طرف سے ملنے والے وظیفے پر گزارہ کرتی ہے۔ اکثریت جنگ زدہ علاقوں سے آئی ہے اور جنگ نے ان کی نفسیات پر بہت بُرے اثرات چھوڑے ہیں۔ معمولی باتوں پر جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ جنگ زدہ علاقوں کے لوگ مستقل خوف کا شکار رہتے ہیں اور خوف احساس عدم تحفظ کو جنم دیتا ہے۔ عدم تحفظ کا احساس جو گل کھلاتا ہے، وہ یہاں سب کے سامنے ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ علاقہ اچھی شہرت کا حامل نہیں ہے۔ وہ تنظیمیں اور افراد جو سویڈن میں مہاجرین کی آبادکاری کے خلاف ہیں، روزن گارڈ کو اپنے مؤقف کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہاں جائیداد کی قیمتیں اور کرائے مالمو کے دیگر علاقوں کی بہ نسبت آدھے یا اس سے بھی کم ہیں۔

یہ سب اپنی جگہ مگر اس علاقے نے زلاتن ابراہیموویچ جیسا سپر سٹار فٹ بالر بھی پیدا کیا ہے جو لاکھوں ڈالر کمانے اور مالمو کے پوش علاقے میں ساحل سمندر کے سامنے محل نما گھر رکھنے کے باوجود روزن گارڈ سے جڑے رہنے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ روزن گارڈ کے داخلی پل پر لکھا ہوا اس کا قول اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں ایک فٹ بال گراؤنڈ ''زلاتن کورٹ'' کو بھی اس کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ مالمو کا مشہور سٹور (City Gross) بھی یہاں ہے۔

ہم محض روزن گارڈ دیکھنے آئے تھے۔ کچھ کرنا مقصود نہ تھا، سو سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہے۔ علاقہ ویسا ہی تھا جیسے سویڈن کے باقی علاقے ہیں۔ کشادہ، سرسبز اور صاف ستھرا، عبایہ پوش اور حجاب پوش خواتین اور روایتی عرب لباس میں ملبوس مرد کہیں کہیں دُکانوں

اور ریستورانوں پر لگے عربی زبان کے بورڈ اس علاقے کا امتیاز تھے۔ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ باربی کیو (جو یقیناً حلال ہوگا) کی اشتہا انگیز مہک فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

''اوہ یار! اگر پتہ ہوتا کہ یہاں چکن باربی کیو ملتا ہے تو گھر سے کھانا کھا کر نہ آتے''۔ میرا ہوٹلنگ کا شوقین بیٹا افسوس کرنے لگا۔

2014ء کا انتخابی معرکہ

''Framtiden ar inte till salu''(فرامتدن انتے تل سالو)

یہ ''فرامتدن'' کیا چیز ہے جو برائے فروخت نہیں ہے؟'' سڑک کے کنارے ایستادہ بورڈ پر تحریر کردہ فقرہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے عماد سے پوچھا۔

''فرامتدن کا مطلب ہے فیوچر''۔ عماد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس فقرے کا مطلب ہے کہ ''Future is not for sale'' ویسے بائی داوے آپ کو اتنی سویڈش کیسے آگئی کہ آپ نے آدھے فقرے کا مطلب سمجھ لیا''۔

''تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ جس گھر کے اُوپر (Till Salu) کا بورڈ لگا ہو اس کا مطلب ''برائے فروخت'' ہوتا ہے اور انتے کا لفظ تو تمہارے بچے اکثر بولتے ہیں۔ اس کا مطلب ''نہیں'' ہے۔

''اوہ! اس کا مطلب ہے میری اماں جان جلد ہی سویڈش زبان سیکھ جائیں گی''۔ عماد نے خوش ہو کر کہا۔

''میرے واپس جانے میں تین ہفتے باقی ہیں اور ان تین ہفتوں میں میں سویڈش میں طاق ہونے سے تو رہی، لیکن ذرا مجھے بتاؤ کہ ''مستقبل برائے فروخت نہیں ہے'' کیا یہاں کے کسی دانشور کا قول ہے؟''

''یہ کسی دانشور کا قول نہیں ہے۔ ستمبر کے وسط میں یہاں انتخابات ہونے والے

ہیں۔ مختلف سیاسی پارٹیاں نئے نئے نعرے ایجاد کر رہی ہیں، یہ بھی کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے لکھا گیا ہے"۔

اس شام سویڈن کی سیاست اور انتخابات کے بارے میں عماد سے تفصیلی بات چیت ہوئی۔ انتخابات کی تاریخ 14 ستمبر قرار پائی تھی۔ حکمران جماعت ماڈریٹ پارٹی سمیت آٹھ چھوٹی بڑی پارٹیاں میدان میں تھیں، جن میں سوشل ڈیموکریٹس، سویڈن ڈیموکریٹس، گرین پارٹی، لبرل پیپلز پارٹی اور کرسچین ڈیموکریٹس وغیرہ شامل تھے۔ کل 349 سیٹوں پر انتخابات ہونا تھے۔

حکمران ماڈریٹ پارٹی 1994ء کے انتخابات میں پہلی دفعہ اکثریتی پارٹی کے طور پر سامنے آئی اور 2010ء کے انتخابات میں سینٹر پارٹی، لبرل پیپلز پارٹی اور کرسچین ڈیموکریٹس کے ساتھ اتحاد کر کے حکومت بنائی اور فریڈرک رین فیلٹ (Fredrik reinfeldt) سویڈن کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ ٹیکسوں میں کمی اور معاشی آزادی ان کے منشور کے اہم نکات ہیں۔

"سوشل ڈیموکریٹس" سویڈن کی سب سے بڑی اور قدیم پارٹی ہے۔ ان کی نظریاتی اساس مارکسی نظام پر رکھی گئی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کبھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی، یہ لوگ جمہوری سوشلزم (Democratic Socialism) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ نسل پرستی کے خلاف ایک مضبوط حزب اختلاف کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ حالیہ انتخابات میں ان کا پلہ بھاری دکھائی دیتا تھا۔

تیسری اُبھرتی ہوئی پارٹی "سویڈن ڈیموکریٹس" تھی۔ جو سوشل کنزرویٹو کہلاتے ہیں۔ یہ دائیں بازو کی پارٹی ہے جو نسبتاً نسل پرستانہ رجحان رکھتے ہیں اور سویڈن میں مہاجرین کی آبادکاری کے حق میں نہیں ہیں۔ اس پارٹی کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ خود سویڈن کے سنجیدہ حلقوں میں تشویش کا باعث ہے۔ انتخابات میں تین ہفتے باقی تھے، لیکن جھنڈے، پوسٹر، وال چاکنگ نظر نہ آتے تھے۔ سڑکوں کے کنارے لگے عارضی بورڈز

پر نعرے درج ہوتے یا دونوں بڑی پارٹیوں ماڈریٹ اور سوشل ڈیموکریٹس کے امیدواروں فریڈرک رین فیلٹ اور سٹیفن لیون کی تصویریں ہوتیں۔ جن پر مخالف پارٹی کے لوگ سیاہی پھینک جاتے یا انگریزی کی چہار حرفی گالی F*** لکھ جاتے۔

ایک شام جب ہم ستورتوریا (Stortoget) میں کارل گستاف وہم کے مجسمے والے چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھے کافی سے شغل کر رہے تھے، ایک شخص کوئی پمفلٹ لئے ہماری جانب چلا آیا۔ پمفلٹ عماد کو دیتے ہوئے وہ کچھ دیر اس سے سویڈش میں گفتگو کرتا رہا۔ عماد کے کچھ پوچھنے پر اس نے ایک ریسٹورنٹ کے باہر برگر کھاتے شخص کی طرف اشارہ کیا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ "یہ آدمی ماڈریٹ پارٹی کی حکومت میں مشیر تھا"۔ عماد نے بتایا۔ "اپنی پارٹی کے حق میں کنویسنگ کر رہا ہے"۔

"کیا یہ خود امیدوار ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ آدمی جو برگر کھا رہا ہے وہ امیدوار ہے"۔ عماد نے بتایا۔

14 ستمبر کو انتخابات کا نتیجہ توقع کے عین مطابق تھا۔ سوشل ڈیموکریٹس 113 سیٹیں جیت کر پہلے نمبر پر تھی۔ حکمران ماڈریٹ پارٹی جو پچھلے انتخابات میں 107 سیٹیں جیتی تھی اب کے صرف 84 سیٹیں جیت سکی تھی۔ دائیں بازو کی جماعت سویڈن ڈیموکریٹس پچھلے انتخابات میں 20 سیٹیں جیتے تھے، اب 49 سیٹیں لے گئے تھے، یعنی پہلے سے تقریباً دوگنی نشستیں حاصل کی تھیں۔

بیارڈ کی ساحلی تفریح گاہ

سمندر میرے لئے ہمیشہ سے ہی بہت متاثر کن رہا ہے۔ اتھاہ، بے انت، بھید بھرا...... جس کے نیلے پانیوں پر آکاش بھی جبیں سائی کرتا ہے۔ جس کے اندر خالق کائنات نے انسانوں کے لئے تازہ گوشت پیدا کیا۔ موتی مونگے مہیا کئے جو انسان کو زینت دیتے ہیں۔ آدمی کو عقل عطا فرمائی کہ وہ اس کے سینے پر جہاز رواں کرے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ

خاموش گہرا سمندر کب بپھر جائے، بستیاں اجاڑ دے، حضرت انسان کی ساری ٹیکنالوجی اور پانیوں کو تسخیر کرنے کے دعوے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔

جن علاقوں میں ان دنوں رہ رہی تھی، وہ بھی تو پانیوں میں ہی گھرے تھے۔ کسی بھی طرف گاڑی کا رُخ کر کے چلنا شروع کرو، دس پندرہ منٹ کے بعد سمندر دکھائی دینے لگتا۔ یہ ان وائی کنگز کا علاقہ تھا جن کی معیشت کسی زمانے میں سمندروں سے ہی وابستہ تھی۔ پانیوں میں ہی سفر کرتے، خوراک کا منبع بھی پانی ہی تھے۔ جنگیں بھی پانیوں میں لڑی جاتی تھیں۔ سمندری مسافر ان سے محفوظ نہ تھے۔ پائریٹ یعنی سمندری قزاق اب بھی ان کے ہاں قدیم تہذیب کے کردار کا درجہ رکھتا ہے۔ تقریباً ہر شہر میں میری ٹائم میوزیم موجود ہے۔ یہاں ہماری ساری تفریح بھی سمندروں کے گرد ہی گھومتی تھی۔ آج کل سمندری قزاقی کا کام صومالی مسلمانوں نے سنبھال رکھا ہے۔

مالمو سے بیس کلومیٹر شمال کی جانب ''لوما'' (Loma) نام کا چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں بیارڈ نامی ساحلی تفریح گاہ سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا مرکز ہے۔ سو ایک ویک اینڈ پر ہم بھی بیارڈ کی سیر کو نکل پڑے۔ مالمو شہر کی حدود سے نکلتے ہی صنعتی علاقہ شروع ہوتا ہے۔ میں نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو عماد نے گاڑی اندر موڑ لی۔ فیکٹریوں کے احاطوں میں سکریپ کی بڑی بڑی گانٹھیں رکھی تھیں۔

''یہ یہاں کی ری سائیکلنگ انڈسٹری ہے'' عماد بتا رہا تھا۔ ''اِدھر کوئی چیز ضائع نہیں کی جاتی۔ کاغذ، شیشہ، پلاسٹک، دھات ہر چیز ری سائیکل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ نامیاتی کچرا (Organic Waste) جو کہ پھل سبزی کے چھلکوں، گلی سڑی سبزیوں اور بچے ہوئے کھانے پر مشتمل ہوتا ہے، اس کو بھی بائیو گیس میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ شہر میں زیادہ تر بسیں بائیو گیس پر چل رہی ہیں۔ یہ لوگ آلودگی کے بارے میں بہت حساس ہیں۔ بچی ہوئی اور زائد المیعاد دوائیاں آپ سنک میں نہیں بہا سکتے۔ وہ میڈیکل سٹور پر واپس کرنا ہوتی ہیں، جو ان کو اپنے طریقے سے ضائع کر دیتے ہیں''۔

صنعتی علاقے کا ایک چکر لگا کر ہم پھر لوما جانے والی شاہراہ پر ہو لئے۔ دس منٹ کے سفر کے بعد ہم دس ہزار نفوس کی آبادی پر مشتمل چھوٹے سے پُرسکون اور خوبصورت قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ سرسبز لان اور سرخ ڈھلوان چھتوں والے خوبصورت گھروں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی بلند و بالا درختوں سے گھری ہوئی شاہراہ بیارڈ کے ریتلے ساحل پر واقع ایک خوبصوت پارک تک جا کر ختم ہوتی تھی۔ عماد نے گاڑی پارکنگ میں لگائی اور بچے جھولوں کی طرف لپکے جوان کے لئے اوّلین کشش کا باعث تھے۔ میں اور مریم بینچ پر بیٹھ کر بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے لگے۔ موسم دھوپ چھاؤں کا ملا جلا سا تھا۔ سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی، تیز ساحلی ہوائیں اور بلند و بانگ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ ایک ناقابل بیان موسیقی کی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ ماحول میں پانی اور سبزے کی ملی جلی مہک رچ بسی تھی۔ سامنے سمندر کے بیچوں بیچ لکڑی کے بنے ہوئے ریستوران کی دو منزلہ عمارت دکھائی دیتی تھی جسے چوبی ستونوں پر اٹھایا گیا تھا۔ ساحل سے ریستوران تک پہنچنے کے لئے تقریباً آدھا کلومیٹر طویل لکڑی کا پل بنایا گیا تھا۔ اتنے خوبصورت شاعرانہ ماحول میں اقبال کے یہ شعر بے ساختہ یاد آتے تھے۔

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورہ والشمس کی تفسیریں ہیں
سرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری
ہے تیرے خیمہ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں اُفق پر جو نظر

ایسے سحر انگیز ماحول سے اُٹھنے کو جی تو نہ چاہے، مگر بچے اب کھیل کود کر کچھ کھانے پینے کے موڈ میں تھے۔ ہم ان کو ساتھ لئے چوبی پُل پر ہو لئے۔ پُل سے جا بجا سیڑھیاں نیچے سمندر میں اترتی تھیں، یہ نہانے کے مقامات (Bathing

(areas تھے۔ سمندر کے شفاف پانی کی تہہ میں اُگی ہوئی سمندری گھاس دکھائی دیتی تھی۔ پل کا اختتام ریستوران کے وسیع ٹیرس پر ہوتا تھا۔ جہاں بیٹھنے کے لئے چوبی بینچ اور میز لگائے گئے تھے۔

ہوا میں اچانک ہی مزید تیزی اور ٹھنڈک در آئی تھی اور میں اس گھڑی کو کوس رہی تھی۔ جب میں نے آج کے دن پہننے کے لئے ریشمی لباس کا انتخاب کر لیا تھا۔ تیز ہوا میں پھسلواں ریشمی چادر سنبھالنا میرے لئے مسئلہ بن گیا تھا۔ سر کے بالوں نے ہوا میں سیدھے کھڑے ہو کر مجھے مزید مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ بچے میری ہیئت کذائی پر مسکرانے لگے اور میں جھلا کر عماد اور مریم کو ڈانٹنے اور خود کو کوسنے لگی۔

''تم لوگ کم از کم مجھے بتا تو دیتے کہ یہاں کس قسم کا لباس مناسب رہے گا''۔

مریم اپنے بیگ میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

''سوری ماما! میرے بیگ میں کوئی سیفٹی پن نہیں ملی، ورنہ آپ کا مسئلہ حل ہو جاتا''۔

''دادو! آئندہ یہاں آئیں تو سر پر کیپ پہن کر آئیں''۔ طٰہٰ صاحب نے اپنی دانست میں صائب مشورے سے نوازا۔

''میرا خیال ہے اندر چل کر ہال میں بیٹھتے ہیں''۔

عماد اندر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ہال کا موسم گرم اور خوشگوار تھا۔ تقریباً تمام میزیں پُر تھیں۔ کافی کی خوشگوار مہک فضا میں پھیلی تھی۔ مریم کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ چیز اینڈ نٹس کیک کا آرڈر دیا اور میری طرف مڑی۔

''ماما! آپ کیا لیں گی؟''

''کپاچینو!''

میں نے سرد ہوتے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے جواب دیا۔

''کپاچینو یہاں نسبتاً تلخ ہوتی ہے''۔ اس نے کہا۔ ''لاتے (Latte) لے لیں۔ یہ کم تلخ کافی ہے۔ آپ کو پسند آئے گی''۔

عماد،مریم،طٰہٰ اور رجا۔بیارڈ میں ایک خوشگوار دن
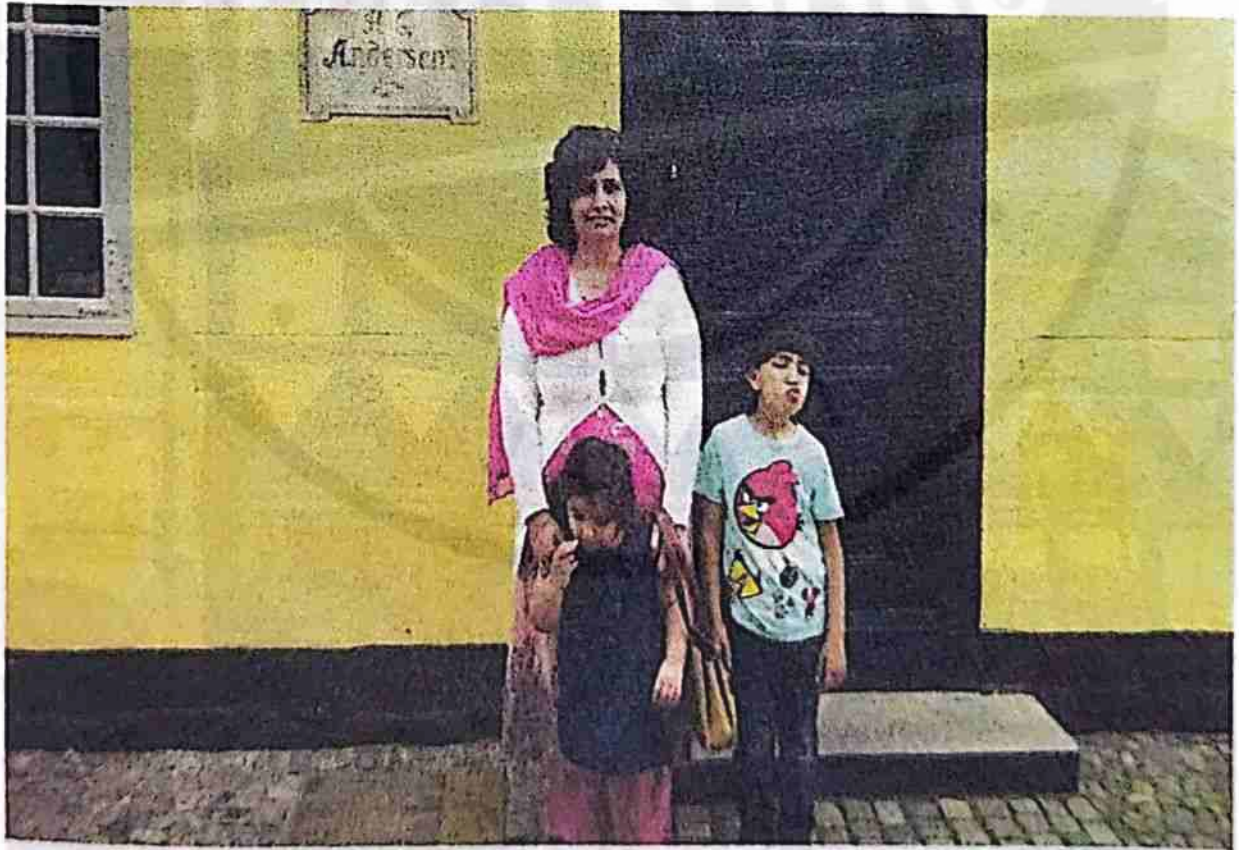
ہا نز کرسچین اینڈرسن کے گھرکے باہر ۔۔ طٰہٰ صاحب مستی کرتے ہوے

فیری کے عرشے سے لی گئی قلعہ ہیلسنگور کی تصویر

مونتر گارڈن کا بیرونی منظر

''ٹھیک ہے جیسے تمہیں مناسب لگے''۔ میں یہ کہتے ہوئے ریستوران کی اوپری منزل پر آ گئی جو خالی پڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے باہر کا جائزہ لیا۔ سمندر میں مرد عورتیں، بوڑھے، بچے بلا تخصیص جنس و رنگ و نسل نہا رہے تھے۔ بادل کچھ اور نیچے کو جھک آئے تھے اور کسی بھی لمحے برسا ہی چاہتے تھے۔ ساحل پر گھنے سرسبز درختوں کی اوٹ سے گھروں کی ڈھلوان سرخ چھتیں جھانکتی تھیں۔ یہ سارا منظر کسی وسیع و عریض خوبصورت پینٹنگ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔

ہمارے کافی پینے کے دوران باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ بادل جو نیچے کو جھک آئے تھے، اب برس رہے تھے۔ کافی اور چیز کیک بہت عمدہ تھے، میں نے مریم کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہنس پڑی۔

''ماما! یہ میں نے تو نہیں بنائے''۔

''ہاں، مگر تجویز تو تمہاری ہی تھی''۔

ہم لوگ ریستوران میں بیٹھے بارش رُکنے کا انتظار کرتے رہے جو چند منٹ برس کر ختم گئی تھی۔ سورج نے بادلوں سے پھر چہرہ نکال لیا تھا۔ دُھلے دُھلائے شفاف نیلے آسمان پر بچے کھچے بادلوں پر پڑنے والی دھوپ نے ان کو چاندی کا سا روپ دے دیا تھا۔ ہم لوگ ریستوران سے نکل کر پُل پر آ گئے۔ عماد اور بچوں نے تیراکی کے لباس پہنے اور سیڑھیاں اتر کر نہانے چلے گئے۔ میں نے بھی چند سیڑھیاں اتر کر پانی میں پاؤں ڈال دیئے اور پھر فوراً ہی واپس کھینچ لئے۔ سمندری پانیوں سے میری آشنائی بحیرہ عرب کے نکھے پانیوں تک ہی محدود تھی، بالٹک کے سرد پانی نے پاؤں کو چھوا تو میں گھبرا کر عماد کو پکارنے لگی۔

''عماد! بچوں کو لے کر اُوپر آ جاؤ کہیں یہ ٹھنڈا پانی اور تیز ہوا تم لوگوں کو بیمار نہ کر دے''۔ مگر وہ مزے سے پانی میں اٹکھیلیاں کرتے، ڈبکیاں لگاتے اور ربڑ کی گیند ایک دوسرے کی طرف اچھالتے رہے۔ غالباً ہوا کے شور کی وجہ سے میری آواز ان تک پہنچ پا رہی تھی۔

''ماما! آپ پریشان نہ ہوں، یہ اس آب و ہوا کے عادی ہیں''۔ مریم نے میری تشفی کرنے کی کوشش کی۔ ''آیئے، ادھر بیٹھیے''۔ وہ مجھے لئے پل سے ملحقہ وسیع عرشے کی طرف بڑھی جہاں لکڑی کے بینچ لگے تھے۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ کر ارد گرد کا نظارہ کرنے لگے۔ کئی لوگ پانی سے نکل کر عرشے پر ستا رہے تھے۔ آدھے گھنٹے تک پانی سے کھیلنے کے بعد عماد بچوں کو لے کر اُوپر آ گیا۔ رجاء ٹھنک رہی تھی، اس کا ابھی دل نہ بھرا تھا، لیکن مریم نے اس کو چمکار پچکار کر واپسی پر راضی کر لیا۔ عماد نے تولیہ لپیٹ کر کپڑے تبدیل کیے، مریم نے بچوں کے کپڑے بدلوائے اور ہم نے واپسی کی راہ لی۔

واپسی کے سفر میں عماد مجھے پوچھ رہا تھا۔ ''ماما! کیسا رہا آج کا دن، چنز اڑ اُڑ جانے کے علاوہ تو کوئی پریشانی نہیں ہوئی؟'' وہ شوخ ہونے لگا۔

''دن بہت اچھا رہا، بہت مزا آیا اور چنز کا کوئی مسئلہ نہیں۔ آئندہ سیفٹی پن لگا کر چنز کو بھی قابو میں کر لیں گے۔ اب سیدھے گھر کو چلو، گھر جا کر کچھ کھانا پکانے کا سلسلہ کریں''۔

''کھانے پکانے کی کوئی فکر نہ کریں، آپ، آج ہم آپ کو ایک اطالوی ریستوران میں کھانا کھلائیں گے''۔

کرولی (Caroli) شاپنگ مال میں واقع اطالوی ریسٹورنٹ (Vapiano) میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑی وہ پاستا بنانے والی مشین تھی جو کچھ کچھ اس ''جندری'' سے مشابہہ تھی، جس کو گیڑ کر ہم بچپن میں سویاں نکالا کرتے تھے۔ میزوں پر پڑے ہوئے بونسائی اور دیگر آرائشی پودے سپاٹ لائٹس کی روشنی میں خوبصورت اور طلسماتی سا تاثر پیدا کرتے تھے۔ جھینگوں کے ساتھ بنا ہوا پاستا جس کے اوپر مختلف قسم کے (Herbs) (اردو میں خوردنی نباتات کہہ لیں) ڈالے گئے تھے۔ منفرد ذائقے کا حامل تھا۔

مجموعی طور پر یہ ایک خوشگوار دن تھا۔ دن بھر قدرتی نظاروں سے لطف اندوز

ہوئے۔ شام کو لذیذ کھانوں سے خوب انصاف کیا۔ گویا لذت کام و دہن بھی اور سکون قلب ونظر بھی...... ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔

کام...... یورپی لوگوں کا خدا

اٹھارہ اگست سے بچوں کے سکول کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ آج پہلا دن تھا کہ وہ چاروں صبح ہی گھر سے نکل گئے تھے۔ طٰہٰ اسکول رجاء ڈے کیئر اور عماد اور مریم آفس جا چکے تھے۔ میں نے باورچی خانے میں جا کر سلائس گرم کئے، انڈہ فرائی کیا، چائے بنائی، ناشتے کے بعد ڈش واشر سے برتن نکال کر کیبنٹس میں رکھے۔ کچھ چیزوں کی ترتیب درست کی، ویکیوم کلیننگ کر ڈالی اور بس......اب کئی گھنٹوں تک میرے کرنے کو کچھ نہ تھا۔ کمپیوٹر پر تازہ اخبار ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ لیا۔ ٹی وی پر کئی پاکستانی چینل بدل ڈالے اور پھر بور ہو کر ریموٹ میز پر ڈال دیا۔ باورچی خانے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر نیچے کمپاؤنڈ کا نظارہ کرنے لگی۔ سامنے والے اپارٹمنٹ کے دریچے میں پھول سجاتی عورت نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر ہاتھ ہلا دیا۔ میں بھی جواب میں ہاتھ ہلا کر مسکرا دی۔

کمپاؤنڈ کا درمیانی حصہ سر سبز لان پر مشتمل تھا جو گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک جانب بائیسکل سٹینڈ بنا تھا جس کے ساتھ ہی ایک قطعے پر ریتلی مٹی بچھا کر بچوں کے لئے پلے ایریا بنایا گیا تھا۔ پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے بیلچے بالٹیاں ہتھ گاڑیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ لکڑی کا چھوٹا سا رنگین ہٹ (Hut) یا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ سلائیڈ اور سی سا بھی لگائے گئے تھے۔

بائیسائیکلوں پر آتی جاتی عورتیں سامان کے بھاری تھیلوں کو اُٹھا کر لے جاتی ہوئی عورتوں سے زیادہ مرد نظر آتی تھیں۔ بچہ گاڑیاں دھکیلتے اور روتے دھوتے نونہالوں کو بہلاتے ہوئے مرد باپ سے زیادہ ماں دکھائی دیتے۔

صنعتی دور کے آغاز کے بعد جب مغرب میں کام کرنے والوں کی ضرورت بڑھ گئی تو عورتوں کو بھی لامحالہ گھروں سے نکل کر دفتروں، فیکٹریوں، بازاروں کا رُخ کرنا پڑا۔

مادی ترقی کی راہ پر گامزن اہل مغرب نے خدا کو اپنے رستے کی رکاوٹ جان کر چرچ میں بند کر دیا اور خود چرچ کا رُخ کرنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے اپنے لئے ایک نیا خدا تراش لیا اور وہ ہے کام......اور کام کے لئے کوئی تخصیص نہیں۔ مرد کی نہ عورت کی......اس نظام نے عورت کی نسائیت اور مرد کی مردانگی کو ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ لوگ مرد عورت کے خانوں میں بٹے ہوئے کی بجائے صرف ورکر بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مرد عورت کے درمیان حیاتیاتی فرق کو بھی مٹا ڈالیں۔

فون کی گھنٹی نے میرے الٹے سیدھے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوسری طرف عماد تھا جو مجھے کہہ رہا تھا۔ "ماما! آپ رجاء کو تین بجے ڈے کیئر سے لے آئیں گی؟"

"کیوں نہیں، بہت خوشی سے لے آؤں گی۔ بس تم مجھے ڈے کیئر سینٹر کا راستہ سمجھا دو"۔

"آپ گھر سے نکل کر نہر کا پل پار کر کے بائیں مڑ جائیں۔ یہ علاقہ ایکسرسائز گاتن کہلاتا ہے۔ یہاں پہلا دایاں چھوڑ کر دوسرے دائیں مڑ جائیں، آپ کو ڈے کیئر سینٹر نظر آ جائے گا۔ باہر لگے ڈائل پر یہ کوڈ لگائیں"۔ عماد نے چار ہندسوں کا ایک کوڈ بتایا۔ "گیٹ خود بخود کھل جائے گا۔ آپ اندر جا کر ان کو بتا دیں کہ رجاء کو لینے آئی ہیں۔ میں نے ان کو فون پر آپ کا بتا دیا ہے اور ہاں پرام ساتھ لے کر جائیے گا۔ آپ کو آسانی رہے گی"۔

ڈے کیئر (Pre School)

مجھے ڈے کیئر ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ آ ہنی گیٹ کے باہر لگے ہوئے ڈائل پر عماد کا بتایا ہوا کوڈ لگایا تو وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ سامنے وسیع و عریض لان کی ایک حصہ باڑھ سے گھرا ہوا تھا۔ جہاں چار پانچ سال تک کے عمر کے بچے کھیل رہے تھے۔ سانولے رنگ اور سیاہ لمبے بالوں الی دبلی پتلی نوجوان لڑکی جوان کی نگرانی کر رہی تھی، باڑھ پھلانگ کر میری طرف آئی۔

''کیا ہم پہلے مل چکی ہیں؟'' وہ انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں، ہم پہلے کبھی نہیں ملے''۔

''آنا''۔اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے تعارف کروایا۔

''منزہ''۔میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''میں رجاء کو لینے آئی ہوں''۔

''میرے ساتھ آیئے''۔وہ مجھے لئے اندر کی طرف بڑھی جہاں رنگین گول میزوں کے گرد رنگ برنگی کرسیوں پر بیٹھے ننھے منے بچے مختلف مشاغل میں مصروف تھے۔کوئی رنگین کاغذ کاٹتا تھا، کوئی کھلونوں سے کھیلتا تھا اور کوئی رنگ برنگی پنسلوں سے کاغذ پر نقش ونگار بناتا تھا۔دو خواتین ان کی نگرانی کر رہی تھیں۔رجاء دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ملحقہ کمرے میں دیوار گیر الماریاں بنی تھیں جن میں سے ہر اک پر بچے کی تصویر لگی تھی۔میں نے رجاء کی تصویر والی الماری کھول کر جیکٹ نکالی اور رجاء کو پہنادی۔باہر سرد ہوا چلنے سے موسم میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

''وہ لڑکی آنا شاید ہندوستانی ہے''۔میں نے اس شام عماد کو رُوداد بتاتے ہوئے پوچھا۔

''خدا کو مانیں ماما! ہندوستانی لڑکیوں کے چہرے پر ایسی معصومیت اور بھولپن کہا ہوتا ہے۔وہ لڑکی چلی سے تعلق رکھتی ہے''۔

عماد کو یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ہندوستانی طلباء وطالبات کی طرف سے کچھ بُرے تجربات ہوئے تھے۔وہ بھارتیوں سے ذرا چڑتا تھا۔

سویڈن میں ایک سے پانچ سال تک کے اسی فیصد بچے ڈے کیئر جاتے ہیں۔

ان میں وہ بھی ہیں جو محض ایک دو گھنٹوں کے لئے جاتے ہیں اور وہ بھی جو آٹھ گھنٹوں تک وہاں رہتے ہیں۔ بچوں کے کھیل کود میں موسم کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ برف باری میں بھی سنوسوٹ (Snow Suit) سنوشوز (Snow Shoes) میں ملبوس بچے بارش سے بے نیاز بھاگتے دوڑتے نظر آتے ہیں۔ بارش اور برف باری کے مخصوص ملبوسات بچوں کے والدین کی طرف سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ جو ڈے کیئر میں موجود ان کی مخصوص الماریوں میں رکھے رہتے ہیں۔ ڈے کیئر میں فیس کا تعین والدین کی آمدنی کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ جو مفت سے لے کر 1350 سویڈش کرونا تک ہے۔ بچوں کو دوپہر کا کھانا ڈے کیئر میں ہی مہیا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں والدین جو ہدایات دیتے ہیں، ان پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ رجاء کے لئے حلال فوڈ پلان دیا گیا تھا، جو مچھلی، سبزی وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اگر بچے کو چھٹی کروانی ہو تو دس بجے تک فون کر کے بتانا ہوتا ہے تاکہ اس کا کھانا نہ بنایا جائے۔

رجاء کو ڈے کیئر سے لانے کی ڈیوٹی بہت خوشگوار تھی۔ میں ڈھائی سے تین بجے کے درمیان وہاں چلی جاتی اور ٹیچرز کو کام کرتے دیکھتی رہتی۔ اس دوران ہلکی پھلکی بات چیت بھی جاری رہتی۔ ان لوگوں نے اگر کام کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے تو اس کو عبادت کی طرح انجام بھی دیتے ہیں۔ ننھے بچے جو ایک سے دو سال کی عمر کے تھے، ان کو فیڈ کرانا ڈائپر تبدیل کرانا، سلانا، یہ سب کام ایک ماں کی طرح لگن سے کرتی تھیں۔ تھوڑے سے بڑے بچے جو تین سے پانچ سال کی عمر کے ہوتے ان کو کھیل کھیل میں سکھاتی بھی رہتی تھیں۔ بچے کھانا کھانے کے بعد ننھے ہاتھوں سے برتن خود اُٹھاتے، بچا ہوا کھانا بن (Bin) میں ڈالتے اور برتن ڈش واشنگ کے لئے مخصوص جگہ پر رکھ دیتے۔

"آپ کے یہاں Pre School کا (Curriculum)

(نصاب) کیا ہے؟"

ایک دن میں نے آنا سے سوال کیا۔

"سب سے پہلے انسانی حقوق کا احترام ہے"۔اس نے جواب دیا۔"ہم یہاں ان کو تحمل، شراکت داری اور اپنی باری کا انتظار کرنا سکھاتے ہیں۔مثال کے طور پر نووا جس کھلونے سے کھیل رہا ہے سارہ اس کو لینا چاہتی ہے۔مگر وہ انتظار کر رہی ہے۔نووا اس کھلونے کو کھیلنے کے بعد اِدھر اُدھر نہیں پھینکے گا، بلکہ اس کی مخصوص جگہ پر رکھ دے گا۔پھر سارہ اس کو لے سکے گی۔اس کے علاوہ ہم بچے کے تجسس اور سیکھنے کے عمل کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔اندرونی صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں اور باقاعدہ سکولنگ (جو پانچ سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے) کے لئے بنیاد مہیا کرتے ہیں"۔

سویڈن اپنی مجموعی قومی آمدنی (GDP) کا 6.3 فیصد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ امریکہ، کینیڈا اور دیگر یورپی ممالک میں یہ شرح اوسطاً 5.7 فیصد ہے۔پاکستان میں تعلیم کا بجٹ 1.67 فی صد ہے جو شرمناک حد تک کم ہے۔

بلادین انٹرنیشنل سکول اور مالمو کے ٹیکسی ڈرائیور

مریم اور عماد نے اپنے کام کے اوقات کے پیش نظر طہٰ کے لئے سکول میں Friteds کی سہولت حاصل کر رکھی ہے۔یہ سہولت رکھنے والے بچے چھٹی کے بعد پانچ بجے تک کا وقت سکول میں ہی گزارتے ہیں۔اس دوران وہ آرام کھیل کود ہوم ورک کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

مریم آج گھر پر ہی تھی۔اس کو ہفتے میں دو دن (Work at home) کی

سہولت حاصل تھی۔ اس نے آٹھ بجے اپنا لیپ ٹاپ کھول کر آفس سے رابطہ قائم کرلیا اور مصروف ہوگئی۔ ڈیڑھ بجے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''طٰہٰ کو چھٹی ہوگئی ہوگی۔ آج ہم اس کو سکول سے ابھی لے آتے ہیں۔ میں نے ٹیکسی کے لئے فون کردیا ہے''۔

سرخ سفید، ادھیڑ عمر اور صحت مند ٹیکسی ڈرائیور دیکھنے میں سویڈش لگتا تھا، لیکن جب اس نے ہمیں السلام علیکم کہا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں حال پوچھا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کو غالباً اتنی ہی اردو آتی تھی، کیونکہ اب وہ مریم کے ساتھ سویڈش میں محو گفتگو تھا۔ سکول پہنچنے تک میں نے دخل اندازی مناسب نہ سمجھی، مگر ٹیکسی سے اترتے ہی اپنے تجسس کو مزید نہ دبا سکی۔

''یہ کون تھا مریم!''

''ماما! یہ انکل افغانستان سے ہیں۔ پشاور اور کراچی میں کچھ وقت گزار چکے ہیں۔ دری، پشتو اور سویڈش زبان جانتے ہیں۔ اردو کے بھی چند فقرے بول لیتے ہیں۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی ان کی ٹیکسی میں سفر کرچکی ہوں''۔ مریم نے تفصیل بتائی۔

بلادین انٹرنیشنل سکول تین منزلہ اور چار منزلہ عمارتوں اور وسیع پلے گراؤنڈز پر مشتمل تھا۔ انٹرنیشنل سکول ہونے کی وجہ سے ہر رنگ و نسل کے بچوں کی ''ورائٹی'' نظر آتی تھی۔

بھورے بالوں اور سفید جلد والے بچے، چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناکوں والے بچے، سانولی رنگت اور سیاہ بالوں والے ایشیائی بچے، سیاہ فام گھنگھریالے بالوں والے افریقی بچے بھاگتے دوڑتے شرارتیں کرتے دکھائی دیئے۔

سکول پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پری سکول (Pre School)

پرائمری ایئر پروگرام	P.Y.P
مڈل ایئر پروگرام	M.Y.P
ڈپلومہ پروگرام	D.P
آفٹر سکول ڈیپارٹمنٹ	Friteds

ہم نے PYP میں جا کر طٰہٰ کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ڈائننگ ہال میں جا چکا ہے۔ اس کے کلاس ٹیچر مسٹر کینتھ اینڈرسن موجود تھے۔ مریم نے ان سے طٰہٰ کی تعلیمی پروگریس کے بارے میں معلوم کیا تو وہ ہمیں کلاس روم میں لے گئے۔ طٰہٰ کا کام اور کاپیاں دکھاتے رہے، اس کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ مسٹر اینڈرسن برطانوی تھے اور آکسفورڈ سے ٹیچنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

ایک سانولی رنگت سیاہ بالوں اور پُرکشش نقش و نگار والی نوجوان لڑکی اپنے ہی جیسے بچے کا ہاتھ تھامے گراؤنڈ میں کھڑی تھی۔ ''لگتا ہے یہ بھی چلّی سے ہی ہوگی''۔ میں نے دل میں سوچا۔

''ہائے!'' وہ مریم سے مخاطب تھی۔ ''طٰہٰ کو لینے آئی ہیں''۔ اس نے شستہ انگریزی میں سوال کیا۔

''ہاں، آج بھی گھر پر تھی تو سوچا کہ طٰہٰ کو جلدی لے آؤں''۔ مریم نے جواب دیا۔ ''یہ میری مدر اِن لا ہیں''۔ مریم نے میرا تعارف کروایا۔

''نمستے!'' لڑکی نے ہاتھ جوڑ دیئے اور میں گڑ بڑا کر رہ گئی۔ (تعصب اچھی چیز نہیں ہے عماد! میں نے دل ہی دل میں عماد کو مخاطب کیا)۔

واپسی کے لئے ہم جس ٹیکسی میں سوار ہوئے اس کے ڈرائیور کی تصویر اور نام والا

کارڈ ڈیش بورڈ پر دھرا تھا۔ ''زاویار سلمان'' (Zaviar Salman) نام سے یہ بھی مسلمان ہی معلوم ہوتا تھا۔

''یہ یقیناً کُرد ہوگا''۔ مریم نے بتایا۔ ''مالمو میں ٹیکسی ڈرائیورز زیادہ تر افغانی اور کُرد ہیں''۔

''IKEA'' فردِ واحد کے عزم و ہمت کی داستان

شہر سے باہر جاتے ہوئے شاہراہ پر ایک وسیع عمارت نظر آئی تھی، جس کی طویل نیلی دیوار پر پیلے رنگ سے لکھا گیا لفظ IKEA دُور سے دکھائی دیتا۔ ایکیا کے بارے میں اتنا زیادہ سنا تھا کہ دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔

ایک مزدور کا نیم خواندہ بیٹا انگوار کمپراڈ (Ingvar Kamprad) جو بچپن میں پھیری لگا کر ماچس بیچا کرتا تھا۔ اس کے دل میں ''کاروبار کو وسعت دینے کا خیال آیا تو اس نے کرسمس ٹری کو سجانے والی مصنوعات اور بال پوائنٹس کا اضافہ بھی کرلیا۔ سترہ سال کی عمر تک اس نے اتنی رقم کمالی کہ وہ سستا فرنیچر بنا کر بیچنے لگا۔ یہیں سے ایکیا کی بنیاد ڈالی اور 2013ء میں انگوار کمپراڈ دنیا کا امیر ترین شخص قرار پایا۔ اس کی قائم کردہ "Ingka Foundation". دنیا کے بڑے خیراتی اداروں میں سے ایک ہے۔ دنیا کے اڑتالیس ممالک میں ایکیا کے تین سو چوراسی سٹور قائم ہیں۔ ایک لحاظ سے ایکیا سویڈن کی پہچان ہے۔

''لوجی! آج ہماری ماما ایکیا سے شاپنگ کریں گی''۔ ایکیا کی وسیع پارکنگ میں گاڑی لاک کرتے ہوئے عماد مجھے چھیڑ رہا تھا۔

''میں صرف ایکیا دیکھنا چاہتی ہوں، شاپنگ کرنے نہیں آئی۔ ویسے بھی تم لوگوں

نے مجھے "شاپنگ بیزار" کا خطاب دے رکھا ہے"۔

"چلیئے، آج میرا دعویٰ ہے کہ اگر آپ بغیر کچھ خریدے یہاں سے نکل آئیں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا"۔ ہم باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انگوار کمپراڈ یونہی دنیا کا امیر ترین شخص نہیں بن گیا۔ ان کو لوگوں کی جیب سے پیسہ نکلوانے کا فن آتا ہے۔

خریداری کا مزہ جس وجہ سے کرکرا ہو جاتا ہے وہ چھوٹے بچے ہیں۔ جن کی بھاگ دوڑ کو قابو کرنے میں توجہ بٹ جاتی ہے اور کئی اہم چیزیں بھی ہم خرید نہیں پاتے۔ یہاں سب سے پہلے اس کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک محفوظ پلے ایریا اور بالکل مفت جہاں جا کر آپ بچے جمع کرائیں۔ ٹوکن نمبر حاصل کریں اور بے فکر ہو کر سٹور کا چکر لگائیں، چیزیں دیکھیں پسند کریں اور خریدیں۔ اب بھلا اس وار سے کون بچ سکتا ہے۔

بنیادی طور پر ایکیا کی وجہ شہرت فرنیچر ہے، مگر گھر داری سے متعلقہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو یہاں نہ ملتی ہو اور چیزوں کا ڈسپلے اتنا خوبصورت کہ بے اختیار خریدنے کو جی چاہے۔ پہلے فلور پر مکمل اپارٹمنٹ سجائے ہوئے تھے۔ بیڈ روم، بچوں کے کمرے، لونگ روم، کچن اور باتھ روم پر مشتمل تھے۔ ہر اپارٹمنٹ میں مختلف ڈیزائن کا فرنیچر تھا۔ فرنیچر کی تیاری میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ سہولت کو زیادہ مدنظر رکھا گیا تھا۔ ایک حصہ باورچی خانے میں استعمال ہونے والی اشیاء پر مشتمل تھا۔ میں جو کچھ نہ خریدنے کا ارادہ رکھتی تھی لکڑی کا بنا ہوا ڈبل روٹی رکھنے کا دیدہ زیب باکس دیکھ کر نہ رہ سکی اور اٹھا کر ٹرالی میں رکھ لیا۔ عماد مجھے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ جیسے کہہ رہا ہو "میں نہ کہتا تھا"۔ مریم نے برتن رکھنے والا ایک دھاتی سٹینڈ لیا۔ ایک فرائی پین لیا۔ میں نے بھی دو عدد پیلر (Peeler) اٹھا کر ٹرالی میں

رکھ لئے، کھلونوں والے سیکشن میں پھرتے ہوئے مجھے صغریٰ بے طرح یاد آنے لگی، ایک رنگین فرنیچر سیٹ بھی لے کر رکھ لیا۔ الماری میں لٹکانے والا ہینگر جس میں بنیان، جرابیں، انڈر ویئر سہولت سے رکھے جاسکتے تھے، لے لیا۔

ان ڈور آرائشی پودوں والے سیکشن پر نرسری کا گمان ہوتا رہا تھا۔ پودوں کو اتنی مہارت سے پیک کیا گیا تھا کہ کہیں بھی لے جائے جاسکتے تھے۔ بانس کے چھوٹے چھوٹے پودے جن کا اُوپر کا سرا بل دار (Spiral) ہوتا ہے جس کو عام زبان میں (Luckey Bambo) (لکی بیمبو) کہا جاتا ہے، ان کی جڑ کے پاس پانی والی پلاسٹک کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ آسانی سے اپنے بیگ میں رکھیں اور کہیں بھی لے جائیں۔ بیڈ لینن کی بہت ورائٹی تھی، لیکن پاکستانی بیڈ لینن کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

میں جو خریداری کا ارادہ نہیں رکھتی تھی، ایک ہزار کرونے کا بل ادا کر کے کاؤنٹر سے ہٹی۔ عماد اور مریم نے ٹوکن دکھا کر بچے "حاصل" کئے اور ہم بھاری تھیلے اُٹھائے ہوئے ایکیا سے باہر نکلے۔ مریم مجھے چھیڑ رہی تھی۔

"ماما! آپ نے تو کچھ بھی نہیں لینا تھا"۔

"ہاں، لیکن "جس کو ہو رقم و جیب عزیز، ایکیا وہ آئے کیوں؟" میں نے غالب کے شعر کی ٹانگ توڑ دی۔

زی لینڈ (Zeland) سے فونن (Funen) تک

میرے بچوں نے ڈنمارک میں کچھ مزید سیاحتی مقامات ڈھونڈ نکالے تھے۔ ڈنمارک کے شہر (Kerteminde) (جس کا مقامی زبان میں تلفظ "کیٹے مینے" ہے) کے نواحی قصبہ Dalby کے ساحلی مقام پر واقع کیمپ ہیورنگے (Camp Hverringe) میں ہٹ بک کروالیا تھا۔ واپسی پر ہمیں ڈنمارک کے تیسرے بڑے شہر اوڈنزے (Odense) سے ہوتے ہوئے واپس آنا تھا جو کہ ڈنمارک کے مشہور ادیب ہانز کرسچن اینڈرسن کا آبائی شہر ہے۔ قدیم تاریخی شہر ہونے کے ناطے یہاں اینڈرسن کے گھر کے علاوہ بھی دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ عماد اور مریم نے اپنے اپنے آفس سے جمعہ کی چھٹی لے لی تھی۔

"ہم جمعرات کو آفس سے آنے کے بعد یہاں سے نکل پڑیں گے۔ ہمیں دن کی طوالت سے فائدہ اُٹھانا چاہئے"۔ عماد کہہ رہا تھا۔ "کیمپ ہیورنگے تک کا سفر تین گھنٹے کا ہے، ہم شام ہونے تک وہاں پہنچ جائیں گے اور اگلے مکمل تین دن سیر و تفریح کے لئے مل جائیں گے"۔ وہ پوری منصوبہ بندی کئے بیٹھے تھے۔

مریم نے بدھ کی شام بیگز اور باسکٹس تیار کر کے رکھ دیئے تھے۔ ہم ایک بار پھر

ڈنمارک کی طرف عازم سفر تھے۔ غروبِ آفتاب کا وقت ساڑھے آٹھ بجے تھا۔ ہمارے پاس کیمپ ہیورنگے تک پہنچنے کے لئے کافی وقت تھا۔

کوپن ہیگن تک تو سفر محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ اتنی دفعہ آ جا چکے تھے کہ لگتا تھا گھر کے آس پاس ہی کہیں گھوم رہے ہیں۔ کوپن ہیگن سے نکل کر عماد نے گاڑی موٹروے پر ڈال دی تھی۔ نکھرا ہوا نیلا آسمان، سرمئی سڑک کے دونوں جانب دھلے دھلائے سرسبز درختوں کی قطاریں اور ہلکا خنک موسم...... یورپ کی گرمیاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی، لیکن ہم جیسے جون جولائی اگست کی حبس ماری گرمی کے ستائے کالے بھورے ایشیائی شاید اس موسم پر زیادہ ہی ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم گریٹ بیلٹ پُل (great belt bridge) پر سفر کر رہے تھے، جو ڈنمارک کے دو بڑے جزیروں فونن اور زی لینڈ کو آپس میں ملاتا ہے۔ یہ بھی سکنڈے نیویا کے بڑے پُلوں میں سے ایک ہے۔ 1998ء میں اس پُل کے افتتاح سے پہلے یہ فاصلہ فیری (Ferry) کے ذریعے ایک گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ اب دس منٹ میں تمام ہوتا ہے۔

سمندری پلوں پر سفر کرنا بھی عجیب تجربہ ہے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اُوپر نیچے پھیلی نیلی وسعتوں کے بیچ اور آہنی جنگلے کے درمیان سرمئی سڑک گاڑی کے پہیوں کے نیچے سمٹی جاتی تھی اور میری سوچ کا راہوار جانے کہاں کہاں دوڑتا بھٹکتا پھر رہا تھا۔ یہ لوگ جنہوں نے سمندر کے سینے پر آہنی ستون گاڑ کر ایسے عظیم الشان پُل بنا لئے، ان کی زمینوں کے نیچے سیاہ سونے کا سیال نہیں بہتا۔ یہاں سونے چاندی کی کانیں بھی نہیں ہیں۔ یہ لوگ سال کے آٹھ ماہ سرد موسموں سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ ایسا کون سا اسم اعظم ان کو ودیعت کیا گیا جس کے زور پر سمندر ان کے زیرِنگیں ہوئے۔ زمینیں سونا اگلنے لگیں و رہوائیں بجلی پیدا کر کے معیشت کا پہیہ چلانے لگیں۔ شاید محنت، لگن اور خلوص نیت سے بڑا کوئی اسم اعظم نہیں۔

فونن (Funen) پر پہلا شہر نی بورگ (Nyborg) تھا، عماد نے ایک ساحلی ریسٹورنٹ پر گاڑی روک دی۔ ''کچھ ریفرشمنٹ ہو جائے'' صاحبزادے ہوٹلنگ کے کچھ زیادہ ہی شوقین واقع ہوئے ہیں۔ کٹے پھٹے سے ساحل پر اُگے ہوئے جنگل اور ٹھہرے پانی کی وجہ سے سمندر جھیل کا سا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہوا میں حسب معمول تیزی اور خنکی پائی جاتی تھی۔ ریسٹورنٹ کے بڑے بڑے شیشوں میں سمندر کا عکس کسی بڑی پینٹنگ کی مانند دکھتا تھا۔ میں نے آئی فون سے مناظر کو فلمانا شروع کر دیا۔ ننھی سی اور بے حد پیاری رجاء بنچ پر کھڑے ہو کر مجھ سے لپٹ رہی تھی اور عماد محبت کے اس منظر کو کیمرے میں قید کرتا تھا۔ مریم کافی کا مگ اور ڈینش پیسٹری لئے ہوئے ریسٹورنٹ کے اندر سے نمودار ہوئی۔

''ماما! یہ ٹرائی کریں، ڈنمارک کی خاص سوغات ہے۔ اس کو یہاں ویز بریڈ (Wiener Bread) کہا جاتا ہے۔ آپ کو یقیناً پسند آئے گی''۔

واقعتاً مریم نے ٹھیک کہا تھا۔ کریم میں لتھڑی ہوئی عام پیسٹری کے برعکس ڈینش پیسٹری ہلکی پھلکی اور مزیدار تھی۔ عماد کو ریسٹورنٹ پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے سروس کے معیار اور بدذائقہ پیزا پر تبرا بھیجتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ وہ کھانے کے معاملے میں معیار اور مقدار پر سمجھوتہ کرنے کا کبھی قائل نہیں رہا۔

جزیرہ فونن (Funen) کے خوبصورت ساحل

ہم کیتے مینے کی حدود سے باہر نکلے تو سورج رخت سفر باندھ رہا تھا۔ شاہراہ کے دائیں طرف فونن کا جنوبی ساحل اور بائیں طرف ہالیڈے ہاؤسز کی قطار ساتھ ساتھ چلتی تھی سورج اپنی بچی کھچی کرنیں سمندر کو دان کرتے ہوئے غروب ہونے جا رہا تھا۔ مریم کے موبائل میں لگا ہوا (Navigator) ہماری رہنمائی کرتا تھا۔ ''دو کلو میٹر تک سیدھے جانا ہے...... پانچ سو میٹر کے بعد بائیں مڑ جائیں اؤنڈ اباؤٹ سے دائیں ہاتھ......'' ہم

اس برقیاتی رہبر کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے منزل کے قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ ڈنمارک کا دیہاتی علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ دور دور بکھرے دیہاتی گھر، وسیع کھیت، چراگاہیں، ملگجے اندھیرے کی پُراسراریت میں ڈوبے تھے۔ گہری ہوتی ہوئی شام میں گھنے درختوں میں گھری ویران بل کھاتی سڑک پر ایک ہماری گاڑی ہی دوڑتی تھی۔ مغربی ادب کی پُراسرار کہانیاں جو نوعمری کے دور میں پڑھی تھیں، ذہن میں تازہ ہوتی تھیں......شاید ابھی درختوں کی اوٹ سے گھڑسوار نمودار ہوگا......قدیم جنگجوؤں کا لباس پہنے ہوئے...... تلوار اور ڈھال سے مسلح۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں تحلیل ہو جائے گا...... یا پھر ایک طویل قامت شخص اوورکوٹ پہنے ہیٹ کے چھجے کو چہرے پر جھکائے سڑک کے عین درمیان میں آ کر ہمیں رکنے کا اشارہ کرے گا...... پھر کیا ہوگا......خوف سے مجھے جھرجھری سی آ گئی، لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

''آپ منزل پر پہنچ چکے ہیں''۔ برقیاتی رہبر نے اطلاع دی۔

عماد نے کیمپنگ کے دفتر جا کر ہٹ کی چابی حاصل کی۔ کیمپ کا نقشہ ہمارے پاس تھا۔ ہٹ نمبر انیس تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دقت نہ ہوئی۔ یہ ایک مکمل طور پر لکڑی سے بنا ہوا ہٹ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا لاؤنج جس کے درمیان میں رکھی ڈائننگ ٹیبل پر چھ کرسیاں الٹا کر رکھی گئی تھیں۔ دائیں ہاتھ کچن کیبنٹس، ایک چھوٹا فریج، ڈش واشر اور کوکنگ رینج لگا تھا۔ کاؤنٹر پر برقی کیتلی، ٹوسٹر، مائیکرو یو اور کیبنٹس میں مکمل کراکری رکھی تھی۔ کونے میں باتھ روم بنا تھا۔ بائیں جانب گلاس وال سے باہر بنے ٹیرس پر ڈائننگ ٹیبل، باربی کیو گرل اور دھلے ہوئے کپڑے سکھانے کا سٹینڈ رکھا تھا۔

لاؤنج میں آمنے سامنے دو کیبن بنے تھے جن کے اندر ڈبل بیڈ لگے تھے۔ ڈبل بیڈ کیا تھے، بس لکڑی کے پلین پلنگ پر دو، دو گدے ڈال دیئے گئے تھے۔ ساتھ میں کپڑے لٹکانے کے لئے بے کواڑ کی الماری بنی تھی۔ ایک کیبن میں ایل سی ڈی ٹیلویژن

دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ دونوں کیبن کے ساتھ لکڑی کی سیڑھیاں لگی تھیں، اُوپری حصوں پر بھی ایک ایک گدا ڈال کر سونے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ گویا یہ چھوٹا سا ہٹ چھ افراد کو اپنے اندر سمو سکتا تھا۔

مریم نے بیگ کھول کر سامان نکالنا شروع کر دیا۔ گدوں پر چادریں بچھائی گئیں۔ تکیوں پر غاف چڑھائے گئے۔ کرسیاں ڈائننگ ٹیبل سے اتار کر نیچے رکھ دی گئیں۔ ایک طشتری میں پھل ڈال کر میز پر سجا دیئے گئے۔ انڈے، ڈبل روٹی، جام، بریڈ، دودھ فریج میں رکھ دیئے۔ بچوں نے ٹی وی والے کیبن پر قبضہ کر کے اپنی پسند کا کارٹون چینل لگا لیا۔ ننھا منا سا ہٹ مکمل گھر کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ عماد نے کمپاس کی مدد سے قبلے کا رُخ متعین کر کے جائے نماز بچھا دی۔ میں نے مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں۔ رات کا کھانا ہم ساتھ لائے تھے، مریم نے کھانا گرم کر کے میز پر لگا دیا۔ آج دن بھر کی بھاگ دوڑ اور سفر نے سب کو تھکا دیا تھا، کھانا کھا کر سو گئے اور نیند کے مزے لینے لگے۔

صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں نے گلاس ڈور کھول کر ٹیرس پر آنے کا ارادہ کیا، لیکن ٹھنڈک نے اندر جا کر سویٹر پہننے پر مجبور کر دیا۔ اوائل ستمبر کی ٹھنڈک ہمارے دسمبر کے اواخر جیسی تھی۔ میں سویٹر پہن کر شال لپیٹتے ہوئے باہر آ گئی۔ روشنی ملگجے اندھیرے کو شکست دیتے ہوئے مناظر کو واضح کرتی جاتی تھی۔ سامنے تاحدِ نگاہ کھلے میدان میں سبزے کا قالین بچھا تھا اور مناسب فاصلے پر لکڑی کے ہٹ بنے تھے۔ ہر دو ہٹس میں اتنا فاصلہ تھا کہ دو گاڑیاں پارک کی جا سکتی تھیں۔ عقبی جانب سنگریزوں کی سڑک کے اس پار ہٹس کی ایک اور قطار تھی۔ میں راستے کی نشانیاں یاد کرتے ہوئے کیمپنگ ایریا کی طرف نکل آئی۔ گھاس کے سرسبز قطعے چار فٹ اُونچے پودوں کی سہ طرفہ باڑھوں کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ کئے گئے تھے۔ ہر قطعے پر کارواں (Carvan) کے ساتھ ملحق ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک کے خیموں میں مکمل گھر آباد تھے، جو مکمل ساز و سامان

سے لیس تھے۔ سورج کی ابتدائی کرنوں کے ساتھ ہی یہاں زندگی بیدار ہو رہی تھی۔ بچوں کے پلے ایریا میں کچھ ننھے سحر خیز مجھ سے پہلے بیدار ہو کر پہنچے ہوئے تھے اور ہوا بھرے گدوں پر اچھل کود کر رہے تھے۔ کیمپنگ کے باورچی خانوں غسل خانوں اور لانڈری میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔

میں ان تعمیرات کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ساحل پر پہنچ گئی۔ طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں تا حدِ نظر پھیلے سنہری سمندر کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ماحول میں رچی بسی نورانیت اور تقدس اَللّٰہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مفہوم قلب پر وارد کرتے تھے۔ واقعی:

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام

میں واپس لوٹی تو مریم ٹیرس کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے جھکی ہوئی تھی۔

''آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟'' وہ مجھے آتا دیکھ کر تعجب سے بولی۔ ''آپ کے کیبن کا دروازہ بند تھا، میں سمجھی آپ سو رہی ہیں''۔

''میں ذرا واک کرتے ہوئے سمندر تک چلی گئی تھی۔ اتنی خوبصورتی ماحول میں رچی بسی ہے کہ جی چاہتا ہے یہیں رہ جائیں''۔

''ایسا سوچئے گا بھی نہیں''۔ مریم نے ہنستے ہوئے کرسی میری طرف کھسکائی۔ ''بیٹھ جائیں ماما! کچھ دیر گپ شپ کرتے ہیں''۔ وہ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ مزے صرف تین چار ماہ کے ہیں۔ یہاں سردیوں کا موسم بہت خوفناک ہوتا ہے۔ بے تحاشا ٹھنڈک، تاریکی اور برف باری اتنا ڈپریشن پیدا کرتے ہیں کہ خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے''۔

''ہمارے جیسے ملکوں میں تو لوگ غربت، بے روزگاری، بیماری اور خاندانی جھگڑوں سے تنگ آ کر خودکشی کرتے ہیں، مگر یہاں تو فلاحی ریاست ماں کی طرح عوام کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بے روزگاروں کے لئے وظیفے، بیماروں کے لئے بہترین طبی

سہولیات، بے گھروں کو گھر فراہم کرنا، ہر چیز حکومت کی ذمہ داری ہے۔ پھر یہ خودکشی؟ آخر ان لوگوں کا مسئلہ کیا ہے؟''

''ان لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان ان کو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایسے میں انسان بے مقصدیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ زندگی فالتو لگنے لگتی ہے اور دوسری بات جو آپ اکثر کہتی ہیں کہ بے خدا معاشرہ ہے۔ بے خدا معاشروں کے اپنے المیے ہوتے ہیں۔ ترقی کی دوڑ میں معاشرتی قدریں بُری طرح روندی جاتی ہیں۔ ایسے میں فلاحی مملکت تو وجود میں آجاتی ہے، مگر فلاحی معاشرہ قائم نہیں ہو پاتا۔ ان لوگوں نے خدا کو دیس نکالا دینے کے ساتھ ساتھ آزادی اظہار کام کی اخلاقیات اور انسانی حقوق کے ساتھ نفسانی خواہشات کو خلط ملط کر کے ایک نئی بائبل بھی تخلیق کر لی ہے اور آسمانی ہدایت کی روشنی کے بغیر بنائے ہوئے معاشرے میں سقم تو ہوگا''۔ مریم کمپیوٹر انجینئر ہے، لیکن وہ ایک ماہر سوشیالوجسٹ کی طرح تجزیہ کر رہی تھی۔

''بیوی! اگر آپ بقراطیت جھاڑنے سے فارغ ہو گئی ہیں تو کوئی ناشتے وغیرہ کا بندوبست کر دیں''۔ عماد جانے کب سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ آ کر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''آپ بھی کبھی کبھی بقراطیت جھاڑ لیا کریں، ہر وقت معدے سے ہی سوچتے ہیں''۔ مریم عماد پر چوٹ کرتے ہوئے اندر کی جانب چلی گئی۔

''اور آپ جیسے سوڈو انٹلکچوئل لوگوں کی وجہ سے ہی پاکستان ایسے حالوں کو پہنچ گیا ہے''۔ عماد بھلا چوٹ لوٹائے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔

مریم نے ناشتے کے لوازمات لا کر میز پر رکھ دیئے تھے۔ طٰہٰ اور رجا بھی آ کر سلام کر کے ناشتے میں شامل ہو گئے۔ دُور تک پھیلے ہوئے سبزے پر نرم گرم دھوپ نے اپنی چمکیلی چادر بچھا دی تھی۔ مناظر مزید واضح ہو گئے تھے۔ سرسبز میدان پر ایک جانب گول کون

(Cone) نما خیمے گڑے تھے۔ یہاں چند روز پہلے قدیم ریڈ انڈین تہذیب کے بارے میں کوئی نمائش ہوئی تھی۔ یہ اس کی باقیات تھے۔ بائیں جانب جہاں میدان ختم ہوتا تھا وہاں بجری کی سڑک کے ساتھ ساتھ درختوں کا جھنڈ کیمپ کی حد بندی کا کام دیتا تھا۔ جھنڈ کے دوسری جانب کھیتوں سے ٹریکٹر چلنے کی آواز آتی تھی۔ ناشتے کے بعد ہمارے ننھے میاں طٰہٰ صاحب کیمپ ہیورنگے سے متعلقہ ایک بروشر کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

"بابا! پہلے ہم سی سائیڈ پر فشنگ کے لئے جائیں گے"۔ وہ اپنی مچھلی پکڑنے کی بنسی ساتھ لے کر آئے تھے جو ان کو سالگرہ پر تحفے میں ملی تھی۔ "پھر ہم پونی رائیڈنگ کریں گے اور دوپہر کے بعد ہم سوئمنگ پول پر جائیں گے"۔ صاحبزادے نے دن بھر کا شیڈول ہمارے گوش گزار کیا۔ پانی میں کھیلنے کی شوقین رجاء کی خوبصورت آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ میں نے طٰہٰ سے بروشر لے کر اس کا جائزہ لیا۔ کیمپ میں بچوں کی دلچسپی کی اتنی چیزیں تھیں کہ تفریح کے لئے دو دن کم تھے۔ ان ڈور پلے ایریا، منی سینما گھر، سائیکلنگ، خچر کی سواری، طرح طرح کے جھولے اور نہ جانے کیا کیا عجائبات۔

خلیج عرب اور بالٹک کے بیچ...... گزرے سال ٹھہرے لمحے

سمندر کے دو سو فٹ اندر جاتے ہوئے لکڑی کے پل کے آخری سرے پر طٰہٰ مچھلی پکڑنے کی بنسی تھامے پانی میں ڈوری لٹکائے کھڑا تھا۔ سمندر کے نیلگوں پس منظر میں ایسی ہی ایک تصویر...... یہی شباہت یہی قد و قامت...... تیز ساحلی ہوا میں اڑتے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرنے کا انداز...... لیکن وہ ساحل خلیج عرب کا تھا، یہ بحیرۂ بالٹک ہے۔ وہ سعودی عرب کا الخبر شہر تھا، یہ ڈنمارک کا کیمپ ہیورنگے ہے۔ وہ پچیس سال پہلے کی بات تھی، یہ لمحہ موجود کا قصہ ہے۔ وہ عماد تھا یہ طٰہٰ ہے۔ پچیس سال پچیس دنوں کی مانند گزر گئے تھے یا لمحے ذہن کے کسی کونے میں ٹھہر گئے تھے۔

''ہاں بھئی کیپٹن! کوئی مچھلی ملی؟'' عماد نے طٰہٰ کے قریب جا کر مخاطب کیا۔

''نہیں بابا! یہاں کوئی مچھلی نہیں ہے''۔ وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے منہ بسورنے لگا۔

''دیکھو، یہاں پانی اتنا کلیئر ہے کہ (seaweeds) تک نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی مچھلی ہوتی تو آپ کو نظر آ جاتی''۔ عماد اس کو سمجھا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے بابا!'' وہ چرخی گھماتے ہوئے ڈوری لپیٹنے لگا۔

ساحل پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ یورپ کے ساحلوں پر کم لباسی کے مظاہرے کوفت میں مبتلا تو کرتے تھے، لیکن قدرتی نظاروں کی خوبصورتی کوفت پر غالب آتی تھی۔ مریم نے مجھے ایک بہت دلچسپ بات بتائی۔ ''ماما یہاں نہانے اور تیرا کی کے لئے بکنی کے مقابلے میں مسلم خواتین کے لئے برکینی متعارف کرائی گئی ہے۔ یہ ایک ڈانگری نما لباس ہوتا ہے، جس کے ساتھ سر ڈھانپنے کے لئے کیپ بھی لگی ہوتی ہے''۔ یقیناً یہ ''برکینی'' اسلام اور مسلمانوں کی محبت میں متعارف نہیں کروائی گئی تھی، بلکہ وہ محدود اقلیت جو بے حجابی کو ناپسند کرتے ہوئے سوئمنگ پولز اور ساحلوں کا رُخ نہیں کرتی، ان سے پیسے کمانے کی خاطر ایجاد کی گئی تھی۔ دیارِ مغرب کے سوداگروں نے کیسے کیسے حیلوں سے خدا کی بستی کو دکان بنا ڈالا ہے۔

کیمپ کے اندر بنے ہوئے چھوٹے سے گروسری سٹور اور کیفے ٹیریا کے باہر لگا بورڈ مفت وائی فائی کی نوید سنا رہا تھا۔ میں نے سبزہ زار پر لگی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے آئی فون کو وائی فائی کے نظام کے ساتھ مربوط کیا تو ٹن ٹن کی آواز کے ساتھ واٹس ایپ پر پیغامات وصول ہونے لگے، جو جانے کب برقی لہروں کے سپرد کئے گئے تھے۔ یہ کچھ تصویریں تھیں۔ سلمان کا گوری گلابی رنگت اور کانچ سی آنکھوں والا بیٹا دائم اور دس ماہ کی کیوٹ سی گڑیا دریم...... جب میں پاکستان میں تھی تو کیسے مجھے دیکھ کر ہمکتی تھی۔ دو ماہ کے

عرصے میں تو وہ مجھے بھول گئی ہوگی۔ میری کم فہم بیٹی صغریٰ نے ماما کے لئے پوز بنا بنا کر تصویریں کھنچوائی تھیں...... بے تحاشا خوبصورت ماحول میں اداسی گھلنے لگی تھی۔

''لیجئے! شکر خورے کو شکر مل ہی گئی آخر''۔ عماد جو سٹور کے اندر سے کاغذی تھیلے اُٹھائے برآمد ہوا تھا، مجھے آئی فون کے ساتھ مصروف دیکھ کر بولا۔

''یہ دیکھو سلمان نے بچوں کی تصویریں سینڈ کی ہیں''۔

''اوہ!'' وہ میرے ہاتھ سے آئی فون لے کر تصویریں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تو ماما اداس ہو رہی ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، وہ زیادہ لاڈلے ہیں نا۔ ہم تو آپ کے کچھ نہیں لگتے، ہمارے پاس تو آپ بس دو ماہ کے لئے آئی ہیں، مہمان بن کر''۔ وہ بلیک میلنگ پر اتر آیا۔

''بکواس نہیں کرو، تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ اگر صغریٰ کا ویزہ مل جائے تو میں ہر سال گرمیاں تمہارے پاس گزارا کروں، لیکن بے معنی اعتراضات لگا کر اس معصوم کا ویزا ریفیوز کر دیا جاتا ہے۔ کہنے کو یہاں معذوروں کو دنیا بھر کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں، لیکن ایک معذور بچی کو یہاں داخلے کی اجازت نہیں ملتی''۔

''یہ سہولتیں ہی تو وجہ ہیں ویزا نہ ملنے کی۔ ان کو خدشہ ہے کہ اگر ہم نے صغریٰ کو مستقل اپنے پاس رکھ لیا تو یہاں کے قانون کے مطابق اس کو تمام ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوگی''۔

''لیکن صغریٰ کو تم کیسے یہاں رکھ سکتے ہو؟ وہ میرے بغیر رہ نہیں سکتی اور میں بھلا پاکستان میں بھرا پرا گھر چھوڑ کر یہاں کے برف زاروں میں کیونکر رہ پاؤں گی؟''

''ہاں، لیکن بات تو سمجھنے کی ہے نا!'' عماد ٹھنڈی سانس بھر کر اُٹھتے ہوئے بولا۔

''آیئے، چلتے ہیں۔ بچے ادھر اِن ڈور پلے ایریا میں کھیل رہے ہیں، ان کو ساتھ لیتے ہوئے ہٹ میں جائیں گے''۔

ان ڈور پلے ایریا کے سامنے بلیئرڈ ہال سے متصل منی سینما گھر میں کسی کارٹون فلم

کی نمائش ہو رہی تھی۔ ہم بچوں کو ساتھ لے کر ہٹ کی طرف چل دیئے جہاں مریم شام کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔

بچوں نے اگلا دن بھی بھرپور انداز میں گزارا۔ عماد پیڈلوں والی فورسیٹر گاڑی نما سائیکل یا سائیکل نما گاڑی لایا تھا۔ وہ مریم کے ساتھ بچوں کو اس میں بٹھا کر کیمپ کی سیر کرواتا رہا۔ دوپہر میں اردگرد کا علاقہ دیکھنے کا ارادہ کیا۔ ساحل کے سامنے بنے ہالیڈے ہاؤسز کی طویل قطار کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کرتے ہوئے ایک ساحلی جنگل کی سیر بھی کر آئے۔ صبح ہم نے یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ کیمپ ہیورنگے پر اترتی شام میں وہ ایک منفرد اور دلربا منظر تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے پرے جہاں کیمپ کی حدود ختم ہوتی تھیں، سفید بادل زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتے تھے جو درختوں کی چوٹیوں سے کچھ اُوپر جا کر دوبارہ زمین کی جانب اُترتے تھے اور پس منظر میں شفق کی لالی پھیلتی تھی۔ ڈھلتے ہوئے دن میں گھر لوٹنے والے پرندوں کی آوازوں میں ٹریکٹر چلنے کی آواز بھی شامل ہوتی تھی۔

میں تجسس کے ہاتھوں مجبور چلتے چلتے جھنڈ کے اس پار چلی گئی جہاں وسیع کھیتوں میں ٹریکٹر چل رہا تھا۔ لاتعداد ننھے سفید پرندے ٹریکٹر کے ہل سے نرم کی گئی مٹی میں سے اپنی پسندیدہ خوراک چننے میں مصروف تھے۔ ٹریکٹر کے نزدیک آنے پر وہ بے شمار پرندے بادلوں کی صورت اُوپر اُٹھتے اور ان کے پھیلے ہوئے پر ایک دوسرے سے مل جاتے تھے۔ ٹریکٹر آگے چلا جاتا تو وہ دوبارہ زمین پر اتر آتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ ایسی اناڑی فوٹوگرافر اس منظر کی تمام تر خوبصورتی کو کیمرے میں قید نہ کر پائی۔

اگلی صبح اتوار تھی، آخری چھٹی کا دن...... کیمپنگ ایریا میں کچھ خیمے سمیٹے جا چکے تھے اور کچھ سمیٹے جا رہے تھے۔ جن کے خیمے ہنوز ایستادہ تھے، وہ غالباً لمبی چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ ہم نے بھی ناشتے کے بعد رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ کیمپ کی طرف سے فراہم کردہ کراکری جو ہم نے استعمال کی تھی، ڈش واشر میں لگا کر مشین کو آن

کر دیا۔ اپنا سارا سامان بیگز میں بند کر کے کرسیاں دوبارہ سے میز پر الٹا کر رکھ دیں اور فرش کی صفائی کر ڈالی۔ عماد نے بیگز گاڑی کی ڈگی میں رکھے، بچے کیمپ چھوڑتے ہوئے ناخوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں وہ ابھی پوری طرح لطف اندوز نہ ہو پائے تھے۔ کیمپ کے دفتر کے سامنے گاڑی روک کر عماد نے ہٹ کی چابی لوٹائی اور ہم واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

آتے ہوئے جو مناظر ملگجے اندھیرے میں واضح نہ ہوتے تھے، دن کی چمکیلی روشنی میں عیاں ہو کر سامنے آ رہے تھے۔ سانپ کی مانند بل کھاتی سڑک جو پہلے اسرار میں ڈوبی نظر آتی تھی، کے دونوں جانب وسیع کھیتوں میں کٹ چکی فصل کی باقیات اور بھوسے کے سنہری گول پہیہ نما گٹھے پڑے تھے۔ دُور دُور بکھرے لکڑی کے ڈھانچے اور کھپریل کی چھتوں والے دیہاتی گھروں میں بعض کے بیرونی دیواروں کے ساتھ لگی ٹوکریوں میں کسان اپنی پیداوار یعنی سبزیاں، پھل، انڈے وغیرہ کے پیکٹ بنا کر رکھ دیتے اور ساتھ ایک گتے پر فی پیکٹ قیمت لکھ کر لٹکا دیتے۔ ایسے ہی ایک گھر کے سامنے رُک کر ہم نے سیبوں کا ایک پیکٹ لیا اور اس کی قیمت جو کہ مبلغ بیس کرونے سکہ رائج الوقت تھی۔ ساتھ رکھے ڈبے میں ڈال دی کہ ادھر یہی طریقہ چلتا تھا۔

کیتے مینے کے ساحل پر جو کہ (Sydstrand) (جنوبی ساحل) کہلاتا ہے، طٰہٰ ایک دفعہ پھر مچلنے لگا۔ ''بابا پلیز یہاں ٹرائی کرنے دیں۔ شاید کوئی مچھلی مل جائے''۔ صاحبزادے کی فرمائش پر رُک گئے۔ مچھلی تو کیا ملتی البتہ پانی میں جیلی فش (Jelly Fish) ضرور دکھائی دیں جو ہمارے کسی کام کی نہ تھیں۔ ہم صرف ان کی تصویریں ہی لے سکتے تھے۔

ہماری اگلی منزل جزیرہ فونن کا سب سے بڑا اور ڈنمارک کا تیسرا بڑا شہر اوڈنزے
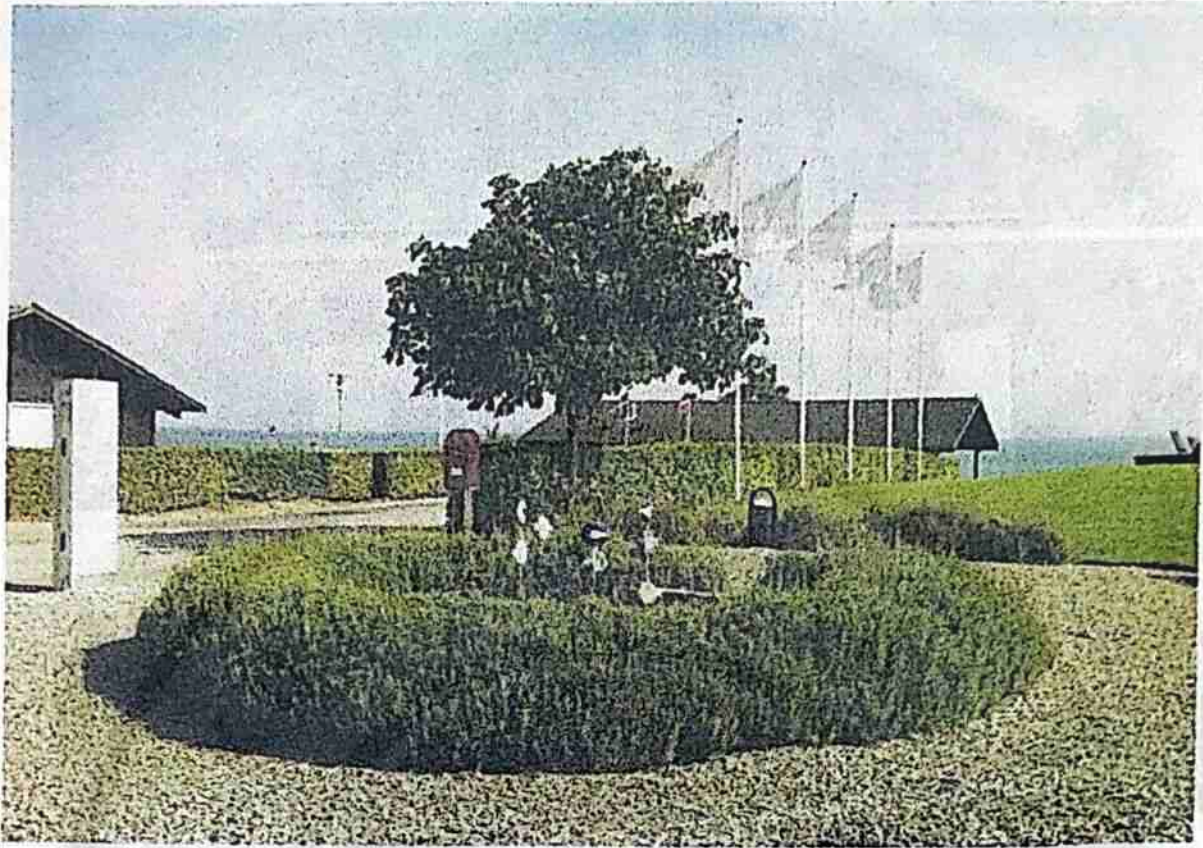
کیمپ ہیورنگے کے خوبصورت مناظر

کیمپ ہیورنگے کے خوبصورت مناظر
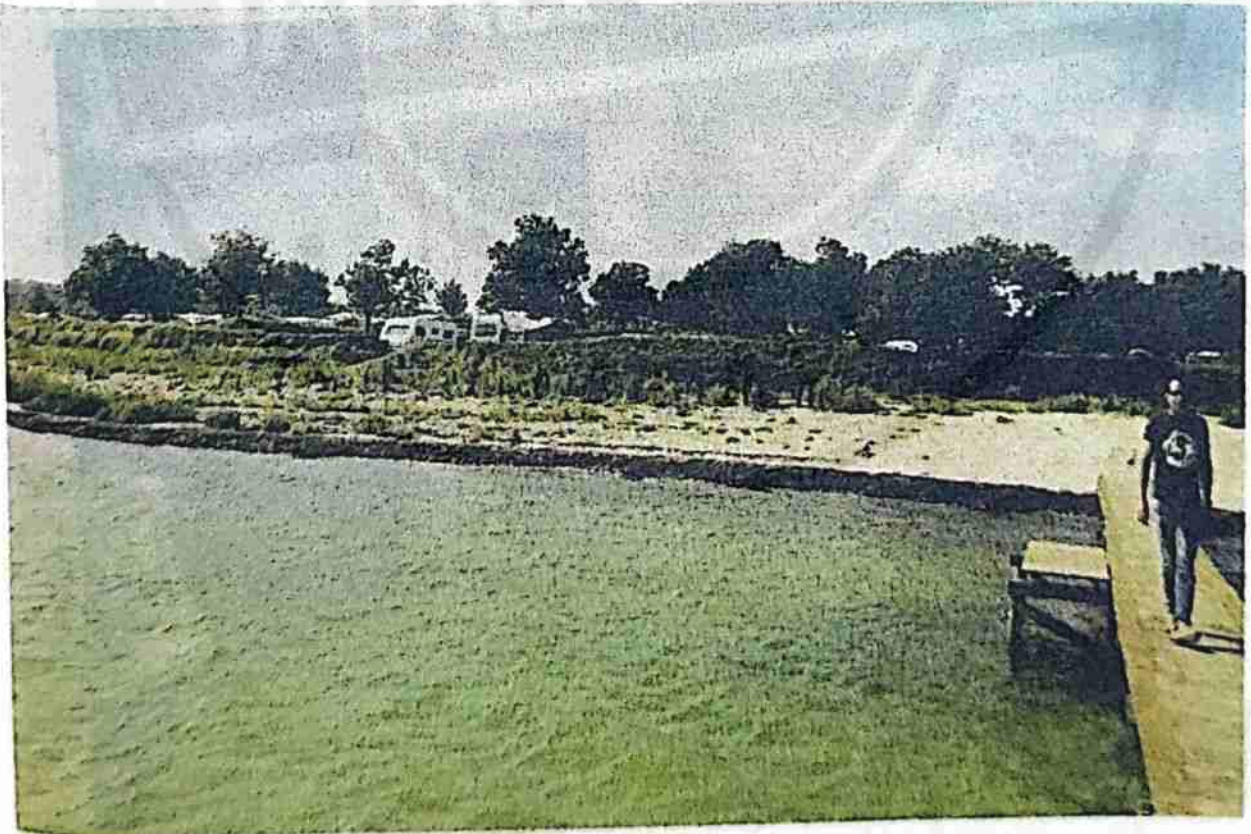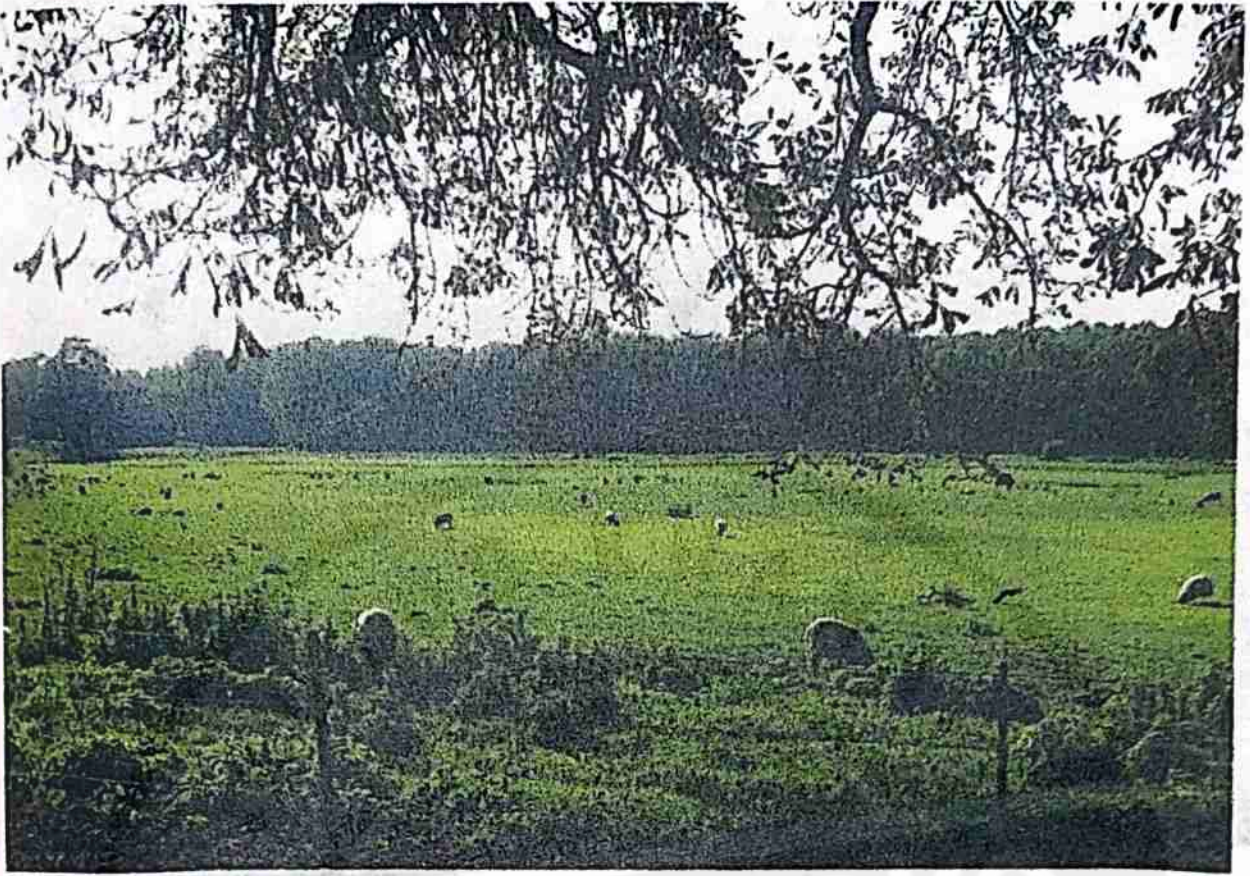
ڈنمارک کے دیہات (۱)

ڈنمارک کے دیہات (۱)

تھا، جو یہاں سے تقریباً پینتیس کلومیٹر دُور واقع تھا۔

اوڈنزے کا پتلی گھر اور چار مجسمے

اوڈنزے کینیو کے باہر چار مجسمے یکساں فاصلے پر ایستادہ تھے۔ پہلا مجسمہ ایک بھکارن کا تھا جو پھٹے ہوئے لانگ بوٹ اور بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ قریب میں اس کا بیگ رکھا تھا جس میں جمع کردہ کاٹھ کباڑ اس کی ادھ کھلی زپ میں سے جھانکتا تھا۔ بے اختیار ن۔م راشد یاد آ گئے۔

"زندگی ایک پیرہ زن
جمع کرتی ہے گلی کوچوں میں روز و شب پرانی دھجیاں"

یوں لگا جیسے مجسمہ ساز نے راشد کی نظم کو انتہائی مہارت سے مجسم کر دیا ہو، اگر اس نے یہ نظم پڑھی ہوتی تو شاید وہ اس مجسمے کو عنوان دیتا "زندگی"۔

دوسرا مجسمہ فٹ پاتھ پر سوئے مزدور کا تھا۔ سرمایہ پرستی کا سفینہ تو نہ ڈوبا مگر یورپ کی حد تک بندہ مزدور کے حالات بہتر ہو گئے تھے۔ گو کہ مارکسی نظام ستر سال بھی نہ چل سکا، مگر سرمایہ داری نے اس سے جو خطرہ محسوس کیا وہ مزدور کو اس کا حق دلوانے میں کامیاب رہا۔

تیسرا مجسمہ اوڈنزے کے فرزند ہانز کو سچن اینڈرسن کا تھا، جس کی ماں دھوبن اور باپ موچی تھا۔ جس کی لکھی ہوئی کہانیوں کے ترجمے دُنیا کی سو سے زیادہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ میں اور مریم مجسمے کے قریب کھڑی تبصرہ کر رہی تھیں۔

"موصوف کافی کم رُو واقع ہوئے تھے"۔

"ہاں، جبھی تو محبوبہ نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیا تھا کہ میں تم سے ہمدردی تو کر سکتی ہوں، مگر شادی نہیں"۔

"اور اب عالم ارواح میں اس سے کہتی ہوگی کہ ہائے، مجھے کیا پتہ تھا تم نے اتنا

مشہور ہو جانا ہے''۔ مریم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کیا بات ہے کس بات پر اتنی ہنسی آرہی ہے''۔ عماد جو دوڑتے بھاگتے بچوں کو قابو کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ ہمارے قریب آکر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں......بس گرلز ٹاک''۔ مریم نے شوخی سے جواب دیا۔

''اگر یہ دونوں گرلز آکر اپنے اپنے بچوں کا خیال کر لیں تو مہربانی ہو گی''۔

''میرا بچہ کافی بڑا ہے ماشاءاللہ، وہ مریم کے بچوں کا بھی خیال رکھ لے گا''۔ میں یہ کہتی ہوئی چوتھے مجسمے کی طرف بڑھ گئی۔ یہ ایک پھیری والے کا مجسمہ تھا جو اپنے بازو پر کچھ رومال ''ڈسپلے'' کیے ہوئے تھا اور اس کا باقی ماندہ مال قریب پڑے بیگ میں رکھا تھا۔

اوڈنزے شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم نے اپنے برقیاتی رہبر (Navigator) کو یہ فرض سونپا تھا کہ وہ ہمیں ''ہانز کرسچن اینڈرسن میوزیم'' پہنچا دے اور اس نے ہمیں اوڈنزے کیتھیڈرل تک پہنچا کر کہہ دیا تھا (Now you are on the destination). (آپ اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں)۔ لیکن میوزیم ہے کہاں؟ ہم مجسموں پر تبصرہ کر چکے تو اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

ہمارے عقب میں قدیم طرز کی لکڑی کے فریم والی ایک عمارت تھی۔ ایسے گھروں کو یہاں (Halftimberd house) کہا جاتا ہے۔ عمارت کی کھڑکیوں میں مختلف اقسام کی پتلیاں لٹک رہی تھیں۔ بڑے سے چوبی پھاٹک کے دائیں جانب 1646ء کی تاریخ درج تھی جو غالباً اس عمارت کی تعمیر کا سال تھا۔ سترہویں صدی کی بنی ہوئی ایسی عمارات سویڈن اور ڈنمارک میں اکثر نظر آتی ہیں۔

''یہی ہو گا ہانز کرسچن اینڈرسن میوزیم''۔ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''نہیں ماما!'' عماد نے میرے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ عمارت سترہویں صدی کی ہے اور اینڈرسن تو 1805ء میں پیدا ہوا تھا''۔ عماد نے درست تاریخی

مونتر گارڈن کی پتلیاں (۳)

مونتر گارڈن کی پتلیاں (۳)

حوالہ دیا تھا۔

عمارت کے کھلے ہوئے چوبی پھاٹک سے ایک ڈینش خاتون دس بارہ سال کی بچی کے ساتھ باہر آ رہی تھی۔

''ایکسکیوز می لیڈی!'' عماد نے انگریزی میں اس کو مخاطب کیا۔ ''کیا آپ ہمیں ہانز کرسچن اینڈرسن میوزیم کا پتہ بتا سکتی ہیں؟''

''وہ یہاں سے قریب ہی ہے''۔ اس نے ہمیں تفصیل سے راستہ سمجھاتے ہوئے کہا، لیکن آپ بچوں کو یہ میوزیم بھی دکھا دیں۔ میں اپنی بیٹی کو دکھا کر لا رہی ہوں، آپ کے بچے بھی اس کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔ یہ چھوٹا سا میوزیم مونتر گارڈن (Monter Garden) کہلاتا ہے''۔ وہ رواں انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

سکنڈے نیویا کے لوگوں میں یہ خوبی ہے کہ یہ لوگ فرانسیسیوں، جرمنوں اور ولندیزیوں کی طرح انگریزی سے نفرت نہیں کرتے۔ گو کہ بہت اچھی انگریزی نہیں بول پاتے، مگر کام چلا لیتے ہیں (یعنی میری طرح کے ہی ہیں)۔ انگریزی میں کچھ پوچھا جائے تو تیوری چڑھا کر ''نو انگلش'' نہیں کہتے، بلکہ خوش دلی سے جواب دیتے ہیں۔

اس بی بی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہم اس ''پتلی میوزیم'' میں داخل ہو گئے۔ کھلی سی ڈیوڑھی کے آگے وسیع و عریض صحن تھا اور بائیں جانب کمرے بنے تھے۔ اینٹوں کے فرش، لکڑی کے بالوں کی چھتیں اور دروازوں کی چوگاٹھیں ہندوستان کے نو آبادیاتی دور کی حویلیوں کی یاد تازہ کرتی تھیں۔ دیواروں پر کھڑکیوں میں طاقچوں کے اندر طرح طرح کی پتلیاں آویزاں تھیں۔ ہمارے بچپن کا پسندیدہ کردار لمبی سی ناک والا لکڑی کا مشہور زمانہ ''پنا کو'' سیڑھیوں کے پاس ایستادہ تھا۔ میں نے طٰہٰ کو اس کے ساتھ کھڑا کر کے تصویر اتاری (جو بعد میں مگ پر پرنٹ کروا کر گفٹ اس کو تحفے میں دے دیا)

سامنے کی دیوار کے ساتھ پتلی تماشے کا سٹیج لگا تھا اور ملحقہ کمرے میں پتلیاں بنانے کی ورکشاپ قائم تھی۔

اینڈرسن کا عجائب خانہ

اس ڈینش لیڈی کے بتائے ہوئے دو چار موڑ مڑنے کے بعد آخر کار ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ پتھریلے فرش والی گلی میں قدیم انداز کے چھوٹے چھوٹے ایک دوسرے سے ملحق گھروں کی قطار کے آخری سرے پر پیلے رنگ کے گھر کی بیرونی دیوار پر H.C. Anderso کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ اس گھر میں 1805ء میں وہ ادیب پیدا ہوا تھا جس کے نیم خواندہ موچی باپ نے اس کو عریبین نائٹس (الف لیلہ) کی کہانیاں سنائی تھیں۔ چودہ برس کی عمر میں وہ کوپن ہیگن چلا گیا تا کہ کچھ کما سکے، مگر تعلیم کی کمی آڑے آتی تھی۔ کسی مخیر شخص کے تعاون سے اس نے دوبارہ سکول میں داخلہ لے کر ادھوری تعلیم کو مکمل کیا۔

اینڈرسن نے بچوں کی کہانیوں کے علاوہ ناول اور سفرنامے بھی لکھے مگر اس کی وجہ شہرت بچوں کے لئے لکھی جانے والی (fairry tailes) ہی رہیں۔ وہ اپنی زندگی میں ہی ڈنمارک سے باہر بھی مشہور ہو گیا تھا۔ انگلستان کے مشہور ادیب چارلس ڈکنز نے ایک ملاقات میں اس کے فن کو سراہا۔

اینڈرسن نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ ستر برس کی عمر میں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی بیوی تھی نہ بچے۔

گھر سے ملحق میوزیم کی عمارت کے داخلی راستے پر چھوٹا سا خوبصورت پارک بنا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے سوینئر شاپ سے واسطہ پڑتا تھا۔ جہاں بنے ہوئے کاؤنٹر سے ٹکٹ حاصل کئے۔ سوینئر شاپ میں اینڈرسن کی تصویروں والے مگ،

شیلڈز کی چین وغیرہ رکھے تھے۔ فیری ٹیلز کے ترجمے چینی، جاپانی اور دیگر زبانوں حتیٰ کہ عربی میں بھی موجود تھے۔ میں اردو ترجمہ تلاش کرتی رہی جو نہیں ملا۔

ٹکٹ خرید کر اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اینڈرسن کا مجسمہ دکھائی دیتا ہے۔ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس، مرکوز روشنیوں میں پیٹ پر ہاتھ باندھے یوں کھڑا ہے، گویا آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ اس کی قلم دوات، مشاہیر کی طرف سے لکھے گئے خطوط، تعلیمی اسناد، ذاتی استعمال کی اشیاء، کپڑے، جوتے شوکیسوں میں خوبصورتی سے سجائے گئے ہیں۔

درمیانی گول کمرے میں شیشے کی گنبد نما چھت سے قدرتی روشنی اندر آتی ہے اور دیواروں پر کہانیوں کو تصویر کیا گیا ہے۔ بعض کہانیوں کے کرداروں کے کاغذی خاکے جو اینڈرسن نے بدست خود کاٹ کر بنائے تھے، وہ بھی شوکیسوں میں لگے ہوئے بورڈز پر چپکائے گئے ہیں۔

عماد ایک دیوار پر خوبصورت خطاطی میں لکھی ہوئی کوئی تحریر پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک بیڈ پر دس فوم کے گدے اُوپر تلے پڑے تھے۔ میں نے متجسس ہو کر قریب سے دیکھا، یہ اینڈرسن کی کہانی (Princess and the Pea) تھی۔ ایک ایسی شہزادی کی کہانی جس کو دس نرم گدوں کے نیچے سے بھی مٹر کا دانہ چبھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یقیناً ایسی ہی نازک مزاج اور گلبدن شہزادیاں سلطنتوں کے زوال کا سبب بنتی ہوں گی۔ میرا ذہن تاریخ کی طرف مڑ گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب یورپ میں یہ کہانیاں لکھی جا رہی تھیں تو برصغیر میں مغل اقتدار آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ دلی میں ایسی ہی شہزادیاں اور شہزادے پائے جاتے تھے......اور انجام؟

میوزیم سے ہوتے ہوئے اینڈرسن کے گھر میں داخل ہوئے، یہ آگے پیچھے بنے ہوئے چھ کمروں والا قدیم انداز کا تھا، مگر بوسیدہ ہرگز نہ تھا۔ بوسیدگی کی حالت میں

1905ء میں لی گی تصویر دیوار پر آویزاں تھی، جب یہ گھر اوڈنزے میونسپلٹی نے قبضے میں لے کر اس کو قومی یادگار کا درجہ دیا تھا۔ اِس گھر کے ایک کمرے میں موچی کے اوزار میز پر سجائے گئے تھے۔ دوسرے کمرے میں اون کاٹنے کی گھریلو سی مشین اور اون کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

سونے کے کمروں میں الماری نما کیبنوں کے اندر بستر لگے تھے۔ یہ انتظام غالباً سردی سے بچنے کے لئے کیا جاتا ہوگا۔ ایک چھوٹی سی میز پر دو پیالیاں اور دو پلیٹیں یوں رکھی تھیں جیسے ابھی آ کر کوئی کھانے کے لئے بیٹھنے والا ہو۔ یہ تمام سامان اینڈرسن کے کوپن ہیگن والے گھر سے لا کر رکھا گیا تھا۔

میوزیم سے فراغت پائی تو دو بج چکے تھے۔ عماد نے اوڈنزے میں بھی حلال ریسٹورنٹ ڈھونڈ نکالا تھا۔ کھانے کے بعد اوڈنزے سٹی ہال سکوائر کو روانہ ہوئے، بھلا کسی شہر میں جا کر سٹی ہال سکوائر نہ دیکھا تو کیا دیکھا۔

اوڈنزے کا سٹی ہال سکوائر (Flak Haven) کہلاتا ہے۔ یہ 1885ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مالمو کے مرکزی سکوائر ''ستورتوریا'' میں کنگ کارل گستاف کا مجسمہ نصب ہے، لیکن فلاک ہاون میں لگا مجسمہ......؟ ایسا عجیب وغریب کہ طبیعت میں تکدر اور بے زاری پیدا کرتا تھا۔ نیم دراز برہنہ عورت کا بھدا سا سیاہ مجسمہ...... یقیناً آرٹسٹ نے اپنے ذہن میں آنے والے کسی خیال کو ہی مجسم کیا ہوگا، مگر جمالیاتی ذوق پر گراں گزرتا تھا۔ سٹی ہال کے عین سامنے ڈانسکے بنک کی عمارت تھی۔ زیادہ تر عمارات سرخ اینٹوں سے تعمیر کردہ تھیں۔ چھٹی کی وجہ سے دفاتر بند تھے، اِس لئے سکوائر خالی خالی سا دکھائی دیتا تھا۔

اوڈنزے میں دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ ریلوے میوزیم، ڈنمارک کے مشہور موسیقار کارل نیلسن کا گھر جس کو میوزیم کا درجہ دیا گیا تھا۔ فونن ولیج (Funen Village) جو کہ ایک اوپن ایئر میوزیم ہے۔ اوڈنزے کا چڑیا گھر...... گویا ست دِن تے اٹھ میلے، گھر جاواں میں کیہڑے ویلے والی کیفیت تھی۔ ہمیں تو آج ہی گھر بھی جانا تھا۔
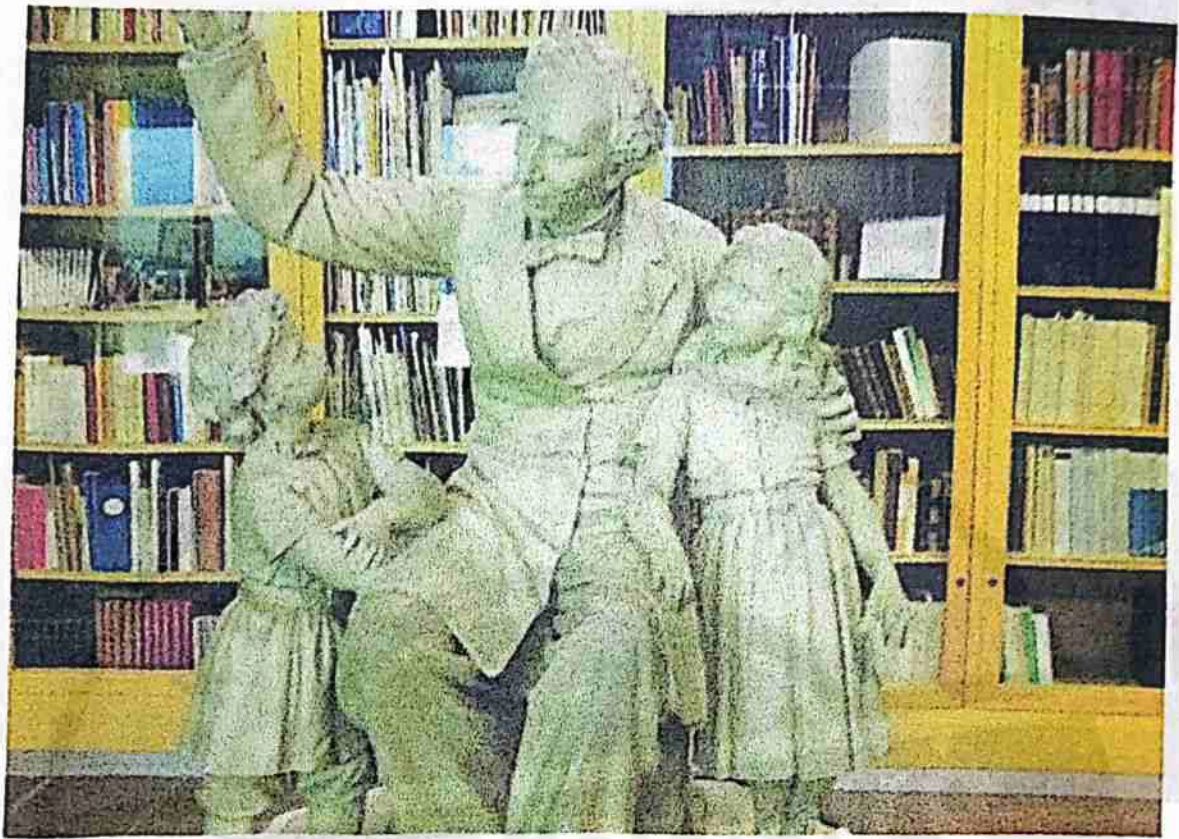
اینڈرسن کے مجسمے (۲)

اینڈرسن کے گھر کے اندرونی مناظر (۱)

عماد،مریم،طہٰ اور رجا۔بیارڈ میں ایک خوشگوار دن
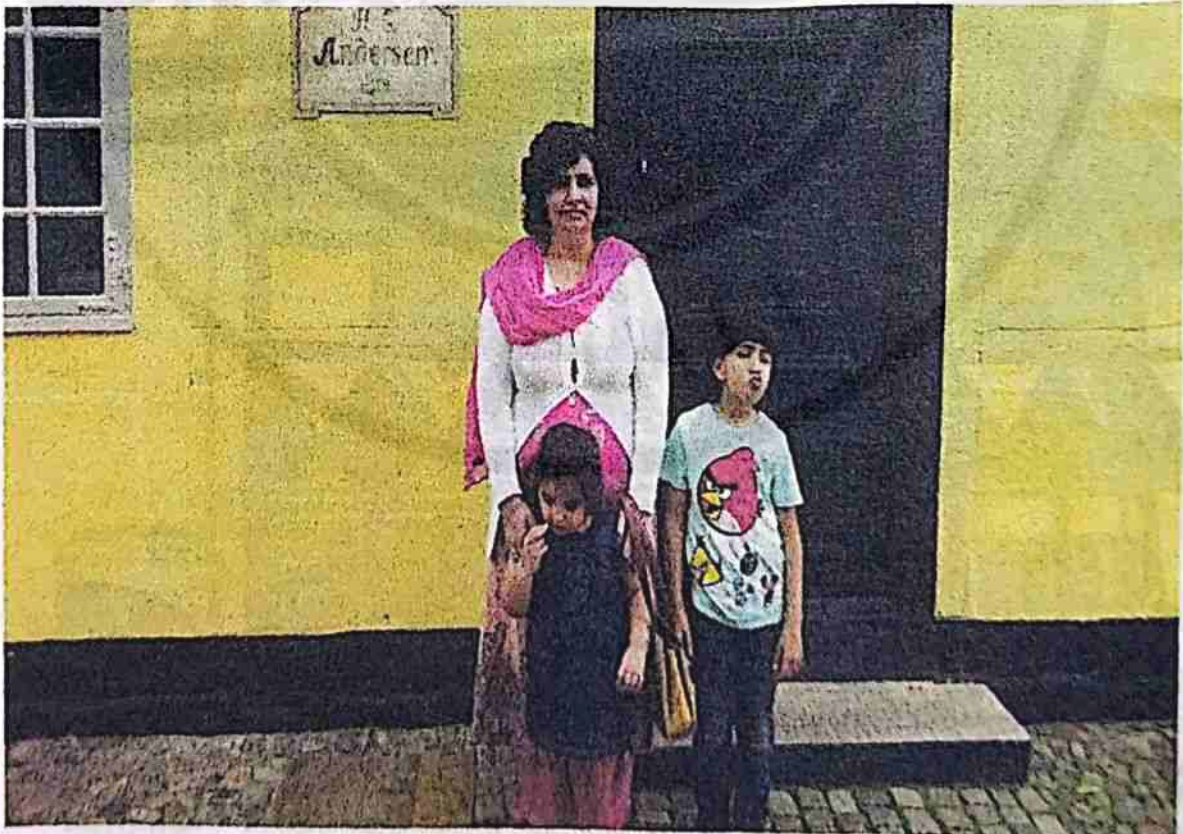
ہا نز کرسچین اینڈرسن کے گھر کے باہر ۔۔ طہٰ صاحب مستی کرتے ہوئے
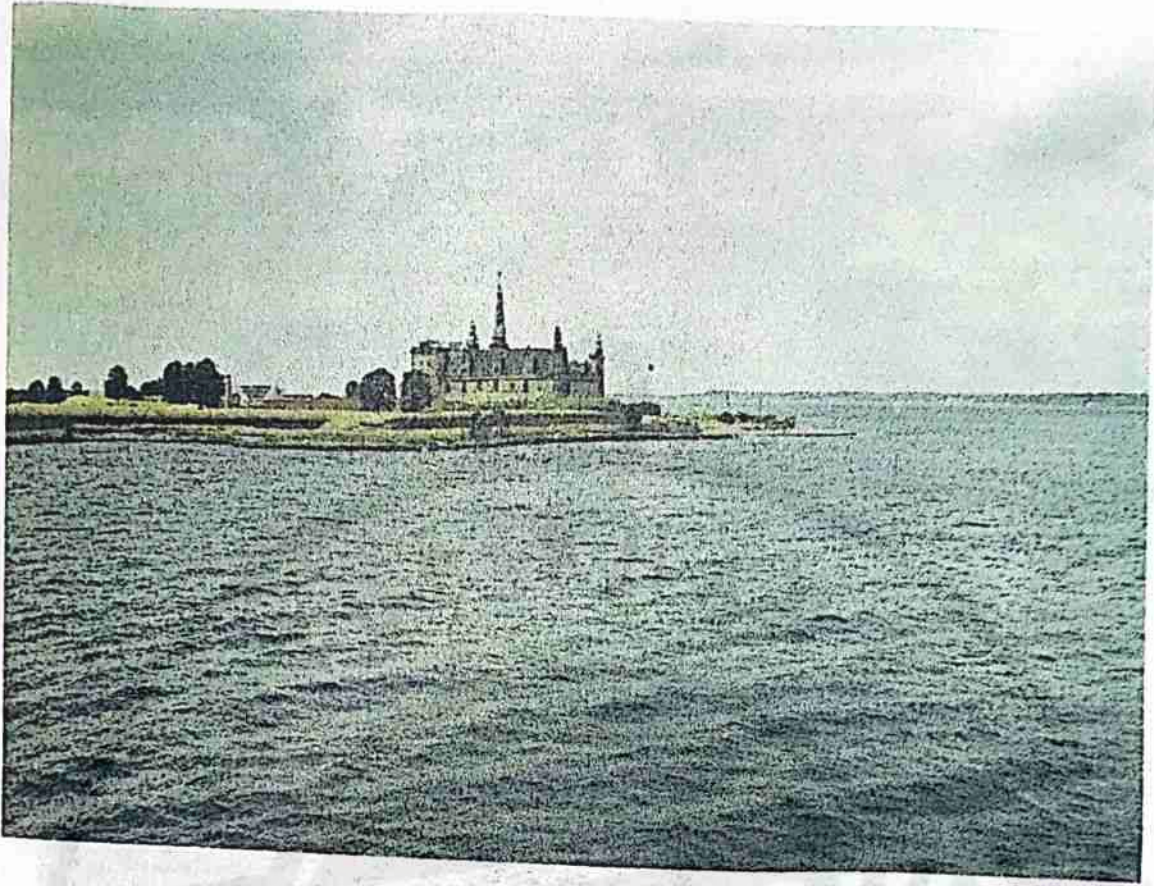
فیری کے عرشے سے لی گئ قلعہ ہیلسنگور کی تصویر

مونٹر گارڈن کا بیرونی منظر

ذکر ایک آنجہانی ٹاور اور فونن ویلج کا

اوڈنزے کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے۔ سن 1988ء میں اِس شہر کی ہزارویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ 1885ء میں یہاں 177 فٹ بلند اوڈن ٹاور (Odin Tower) تعمیر کیا گیا تھا، جو ایفل ٹاور کے بعد یورپ کا دوسرا بلند ترین ٹاور تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں ڈنمارک پر نازی قبضے کے دوران ڈینش نازیوں کے ایک گروپ نے اوڈن ٹاور کو تباہ کر دیا۔

کچھ عرصہ سے مذہب بیزار لوگوں نے شد و مد سے یہ بات پھیلانا شروع کر دی ہے کہ انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ خوں ریزی مذہب کے نام پر کی گئی ہے۔ کوئی مجھے بتائے کہ جنگِ عظیم اوّل و دوم مذہب کے نام پر لڑی گئی تھیں؟

کیا وائی کنگز جو چار سو سال تک آپس میں لڑتے رہے، مذہب کے نام پر لڑے؟

کیا وسطِ ایشیا سے آنے والے فاتحین مذہب کے نام پر برصغیر کو روندتے رہے؟

یورپی اقوام کی ''تلچھٹ'' امریکہ میں ریڈ انڈینز اور آسٹریلیا میں ایبوریجنز کا قتلِ عام کس مذہب کے نام پر کرتی رہی؟

نہیں صاحب! ہوسِ اقتدار و ملک گیری اور طاقت کا اندھا جنون ہی خون ریزی کی اصل وجہ ہے۔

یہ بات تو برسبیل تذکرہ بیچ میں آ گئی۔ ذکر فونن ویلج کا ہونے جا رہا تھا۔ اوپن ایئر میوزیم کی اصلاح میرے لئے نئی تھی۔ سو یہی دیکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ پاکستان میں سب کو بتا سکیں کہ ''ہم نے اوپن ایئر میوزیم بھی دیکھا''۔

فونن ویلج جانے کے لئے ہم نے ایک بار پھر اپنے برقیاتی رہبر سے مدد لی۔ اگلے دس منٹ میں ہم وسیع و عریض پارکنگ والی چھوٹی سی عمارت کے سامنے گاڑی پارک کر رہے تھے۔ جس کے ماتھے پر (Den Fynske Landsby) کے الفاظ تحریر

تھے، جو فونن ویلیج کا ڈینش نام ہے۔ یہاں سے ٹکٹ حاصل کر کے پچھواڑے کی سیڑھیاں اُتر کر اُس گاؤں میں داخل ہوئے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دیہاتی کلچر کی نمائندگی کرتا تھا۔ یہ چوبیس عمارات پر مشتمل ہرا بھرا گاؤں تھا، جس میں فارم ہاؤسز، سکول، ہسپتال، پن چکی (Water mill) پون چکی (Wind mill) اور اوپن ایئر تھیٹر شامل تھے۔ ہم ستمبر کے شروع میں یہاں آئے تھے، یہ تھوڑی تاخیر تھی، کیونکہ جولائی اور اگست کے مہینوں میں یہاں کام کے عملی مظاہرے کئے جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے دیہاتی ملبوسات پہنے مرد وزن قدیم زرعی آلات کے ساتھ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بار برداری کے لئے گھوڑا گاڑیاں اور چھکڑے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ گویا کوئی ٹائم مشین ہے، جو یہاں آنے والوں کو اٹھارہویں صدی میں لے جاتی ہے، ہم نے یہ مناظر مس کر دیئے تھے۔

سیڑھیاں اُتر کر گاؤں میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے سوؤروں کے باڑے سے واسطہ پڑا، جو یورپی دیہاتی معاشرے کا اہم جزو ہیں۔ ہم ان گندے بدبودار جانوروں سے ذرا پرے پرے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ہری بھری چراگاہ کے بیچوں بیچ پر پھیلائے کھڑی پون چکی (Wind mill) کے قریب چرتی ہوئی بڑے ہوانے والی صحت مند سرخ گائیں دانہ دُنکا چگتی دیسی مرغیاں، قیں قیں کرتی بادلوں سی سفید بطخیں دیکھ کر سوؤروں کے ''متھے لگنے'' کی کوفت ہوا ہوگئی۔

شکر ہے کوئی حلال جانور تو نظر آئے۔ ایمان کی تجدید ہوگئی!

عماد مزاحیہ انداز سے گویا ہوا۔

سکول کی عمارت میں کلاس روم جس انداز سے آراستہ کئے گئے تھے، وہ اِس حقیقت کو عیاں کرتے تھے کہ ہمارے دیہاتی سکول ابھی یورپ کی انیسویں صدی کے معیار کو بھی نہیں پہنچے۔ یاد رہے کہ ڈنمارک میں 1914ء میں لازمی سکول حاضری کا قانون پاس ہوگیا تھا۔ ہم دُنیا سے دوسو سال پیچھے رہ کر دُنیا فتح کرنے کا خواب دیکھتے ہیں...... ہم

سے بڑا احمق بھی کوئی ہوگا؟

طٰہٰ ڈیسک پر رکھی لوہے کی سلیٹ دیکھ رہا تھا، جس کے پیلے حاشیے میں چھوٹا سا سوراخ کر کے ڈوری باندھی گئی تھی۔ اور ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک ٹا کی بندھی ہوئی تھی۔ یہ ہمارے بچپن کا اہم آلہ تعلیم (Educational Tool) تھا۔ جب میں نے طٰہٰ کو سلیٹ کا طریقہ استعمال سمجھایا تو وہ مسکرانے لگا۔ دادو آپ اس پر کوئسچن سالو (Question Solve) کرتی تھیں؟ ہاؤ فنی! گاؤں کے تمام گھر لکڑی کے ڈھانچے والے (Half Timberd House) تھے۔ ایک کھلی سی ڈیوڑھی سے گزر کر جس کی دیواروں پر قدیم زرعی آلات آویزاں تھے، ہم ایک وسیع احاطے میں داخل ہوئے۔ یہ انیسویں صدی کا ایک فارم ہاؤس تھا۔ احاطے میں ہینڈ پمپ لگا تھا جو یقیناً پانی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ رہا ہوگا، کیونکہ ہمیں کسی گھر کے اندر نلکے یا پائپ نہیں ملے تھے۔ کمرے میں میز کے گرد پانچ افراد کھانا کھا رہے تھے۔

اوہ! میں نے بڑھا ہوا قدم واپس ہٹا لیا، لیکن یہ کیا؟ یہ جیتے جاگتے انسان نہ تھے، بلکہ (Dummies) تھے۔ گھر کا اندرونی ماحول نیم تاریک اور افسردگی میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ عرصہ ہوا کسی رسالے میں عالمی شہرت یافتہ ڈچ مصور وان گوگ (Van Gogh) کی شہرہ آفاق پینٹنگ (Potato Eaters) دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایسا ہی افسردہ اور نیم تاریک ماحول وان گوگ نے پینٹ کیا تھا۔

لکڑی کی پڑچھتیوں پر سجے دھاتی برتن مٹی کی کنالیاں، لوہے کے چھاننے جو وہاں موجود تھے، ہمارے دیہات میں ابھی تک استعمال ہو رہے ہیں۔ دودھ رکھنے کی جستی کپیاں بھی اب یہاں عجائب خانے تک محدود تھیں۔ فارم ہاؤس کے ایک حصے میں شراب کشید کرنے کے آلات اور بڑے سائز کے ڈرم بھی رکھے تھے۔

ہم نے باقی گھر بھی گھوم پھر کر دیکھے۔ ایک گھر جو خاصے متمول مکینوں کا معلوم ہوتا تھا، دوسرے گھروں کی نسبت بڑا اور کھلا سا تھا۔ یہاں بھی Dummies کی مدد سے طرزِ

زندگی کو واضح کیا گیا تھا۔ باورچی خانے میں کام کرتی خادمائیں، پڑھائی میں بچوں کی مدد کرتی ماں، ڈرائنگ روم میں کرسیوں پر محوِ گفتگو مرد...... خواتین کی ہر ڈمی، میکسی فراک یا لانگ سکرٹ میں ملبوس تھی۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ میں بھی پورا بدن ڈھانپنے کو تہذیب کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں جب برصغیر میں بڑے گھیر والے لہنگوں، غراروں اور پانچ پانچ گز کے دوپٹوں کا رواج تھا۔ یورپ میں بھی زیادہ چنٹ والے لمبے لمبے فراک اور سکرٹ پہنے جاتے تھے۔ لباس کی تیاری میں زیادہ سے زیادہ کپڑا استعمال کرنا امارت کی نشانی تصور کیا جاتا تھا۔ جب یورپ کی خواتین نے کام کے لئے باہر نکلنا شروع کیا تو بڑے کپڑے کام میں رکاوٹ محسوس ہونے لگے، پھر گھیر سمٹتے گئے، لمبائیاں کم ہوتے ہوئے گھٹنوں سے بھی اوپر چلی گئیں، کام کا ایسا جنون طاری ہوا کہ کوئی فاصلہ نہ رہا۔

دامن کے چاک میں اور گریباں کے چاک میں

گویا کہ عملیت پسندی نے مختصر لباس کو فروغ دیا۔ گھروں میں رکھی تمام اشیاء باریک سی تار کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک تھیں، ابھی ہم تار پر غور کر ہی رہے تھے کہ رجا نے کسی برتن کو اُس کی جگہ سے ہٹا دیا اور ساتھ ہی الارم بے حد کریہہ آواز میں بجنے لگا۔ بچی تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی، مگر الارم کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ دیگر سیاح بھی کانوں میں اُنگلیاں دیئے باہر نکل آئے۔ چند منٹ کے بعد الارم خود بخود خاموش ہو گیا تو کائنات میں جیسے سکون در آیا۔ ہمارا خیال تھا کہ عملے کا کوئی فرد چیک کرنے آئے گا، مگر کوئی نہ آیا۔ شاید انہوں نے C.C.TV پر صورت حال ملاحظہ کر لی تھی۔ ہمیں تار کا مصرف سمجھ میں آ گیا تھا۔

کھیتوں میں چقندر کی فصل پر جوبن تھا۔ ایک الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں دو پہیوں والے چھکڑے پر بڑا سا دھاتی ڈرم رکھا تھا، جس پر طویل پائپ لپٹا ہوا تھا۔ یہ
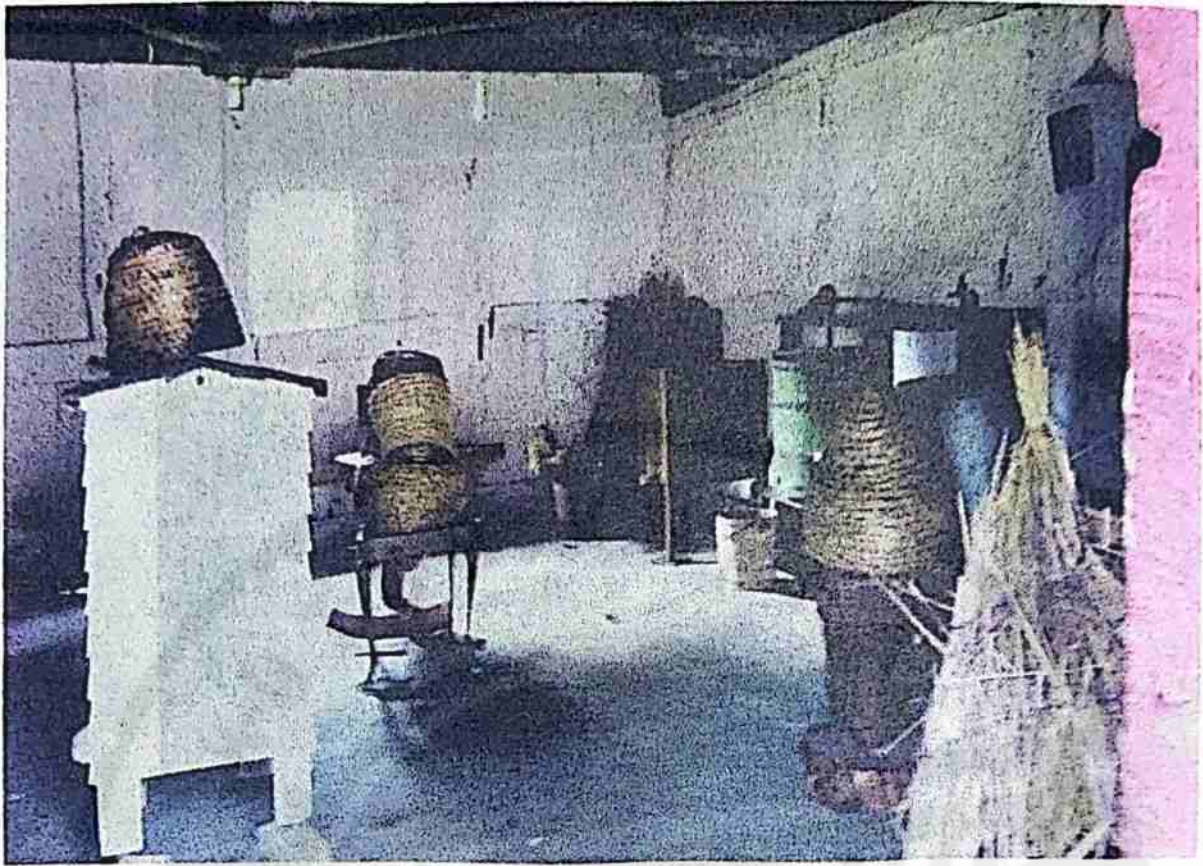
فونن ویلج میں گھروں کے اندرونی مناظر
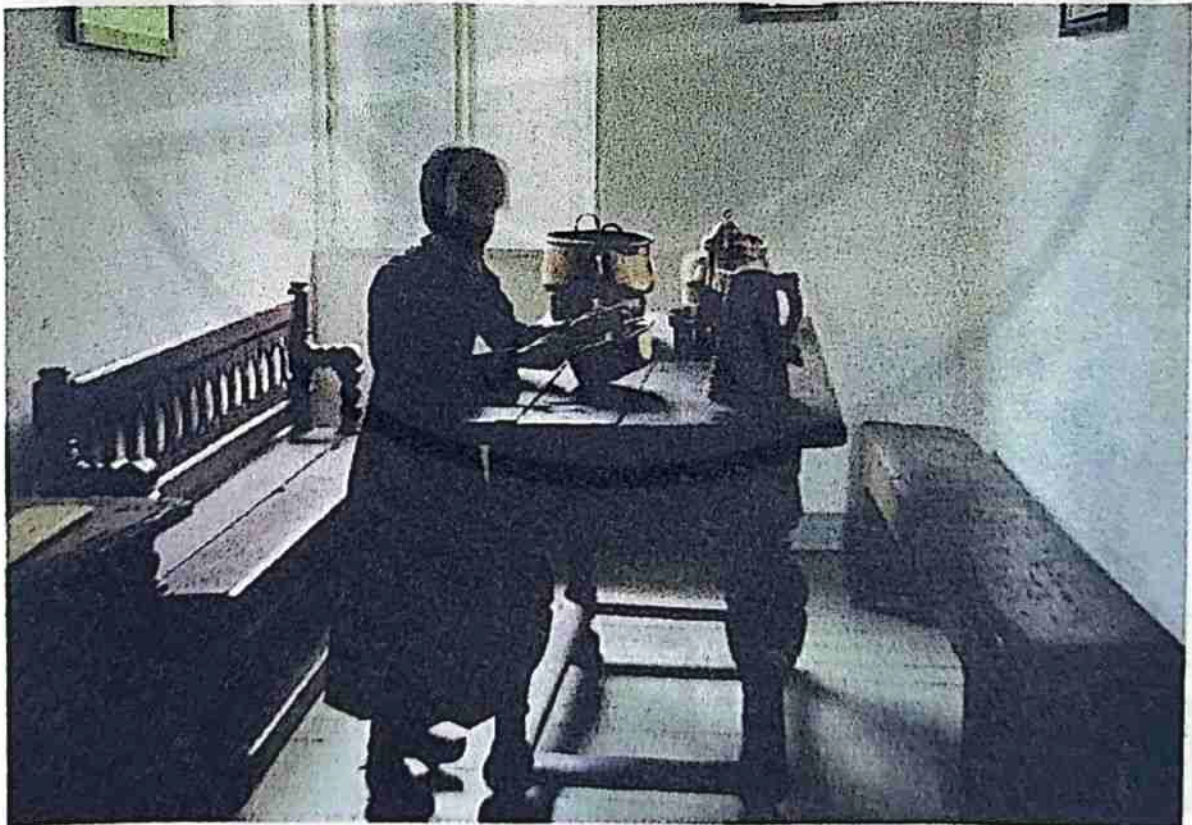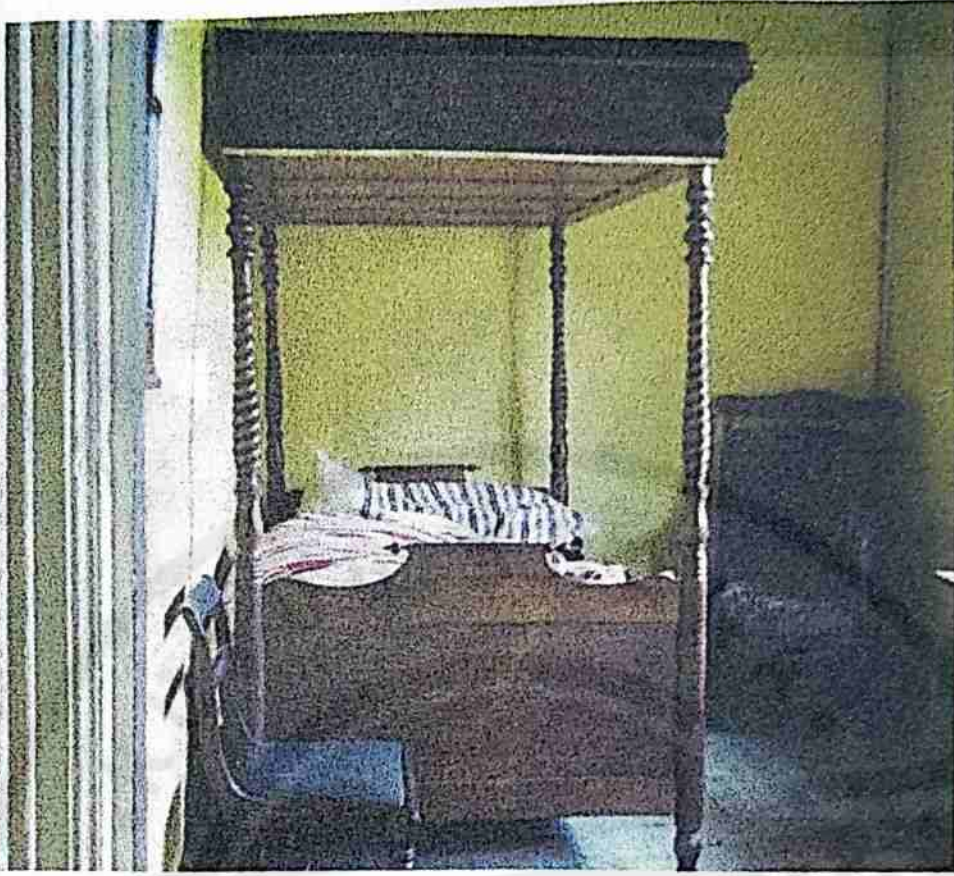
فونن ویلج میں گھروں کے اندرونی مناظر
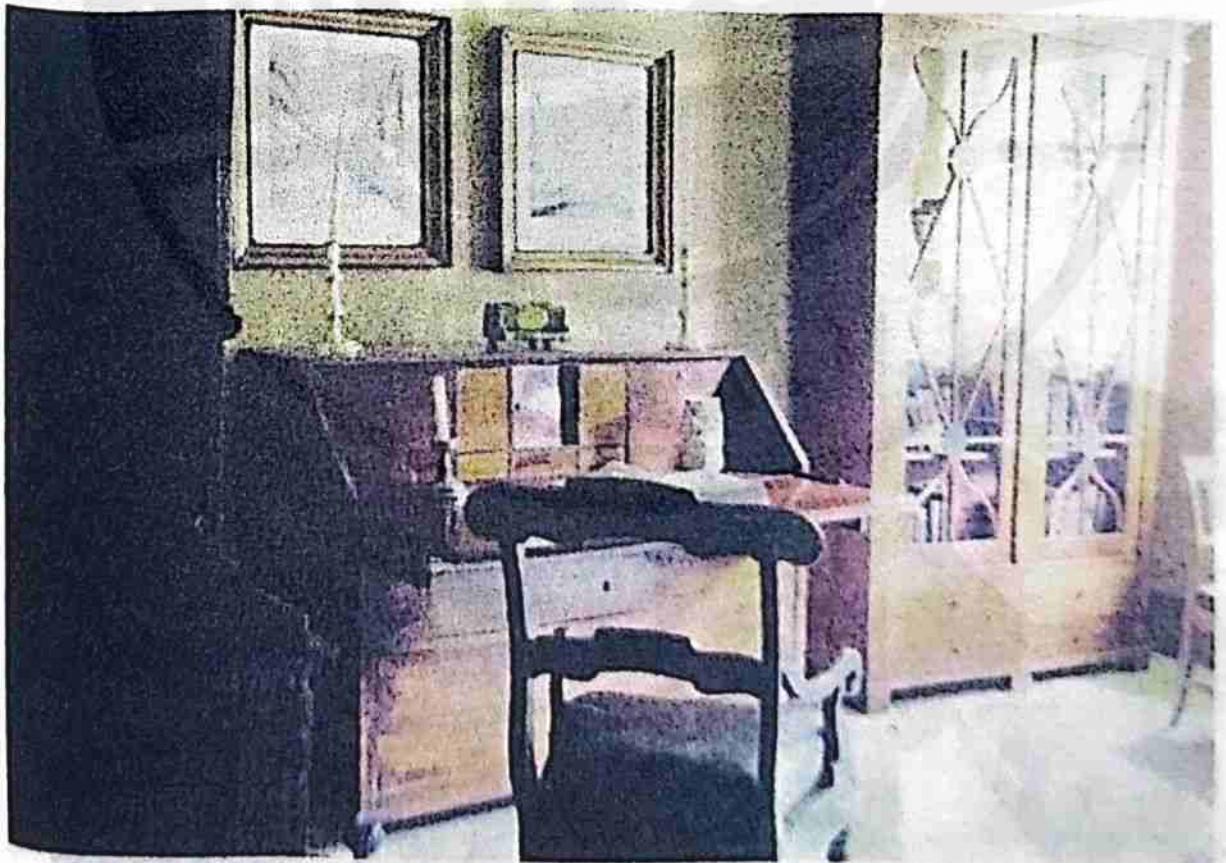
فونن ویلج (۳)

فونن وِیلج (۱)

گاؤں کا فائر سٹیشن تھا۔ ہم ڈھائی گھنٹوں سے یہاں گھوم رہے تھے۔ سب کچھ دیکھ پائے یا نہیں، مگر اب تھکن غالب آنے لگی، سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ہال میں آئے۔ مریم ریفریشمنٹ کے لئے کچھ لینے کے لئے کاؤنٹر پر چلی گئی۔

کیا آپ نے آج کوئی اور میوزیم بھی دیکھا ہے؟ کاؤنٹر پر کھڑی خوش شکل دراز قامت لڑکی نے سوال کیا۔

ہاں! آج ہم H.C. Anderson میوزیم بھی گئے تھے۔ مریم نے جواب دیا۔ ''آج کے دن کے لئے خصوصی ڈسکاونٹ...... اگر آپ ایک میوزیم کا ٹکٹ خریدیں تو باقی پر بیس فیصد رعایت ہے...... آپ کے چار ٹکٹ تھے۔ یہ رہے آپ کے اسی کرونے''۔

"TAK" (شکریہ) مریم نے رقم لے کر پرس میں رکھ لی۔

''چلو بیگم ریفریشمنٹ تو مفت میں ہی ہو گئی''۔ عماد مسکرانے لگا۔

شہر گل میں خزاں

اکتوبر 2006ء کا کوئی دن تھا۔

شمالی سویڈن کے شہر رونیبی (Ronneby) میں خزاں کا رنگوں بھرا آغاز تھا۔ میپل کے درختوں، ریڈ بڈ اور سموک بش کی جھاڑیوں کے پیرہن بتدریج سبز سے آتشی میرون اور زرد ہوئے جاتے تھے۔ ایسی خوبصورت خزاں میں ایک نوجوان طالب علم اپنی ساتھی طالبہ کا ہاتھ تھامے ٹرین سے اترا۔ دونوں نے اپنا سامان اُٹھایا، ریلوے سٹیشن سے باہر آکر ٹیکسی والے کو کاغذ پر لکھا ہوا ایڈریس دکھایا۔ ٹیکسی والے نے پانچ منٹ کے سفر کے بعد ان کو مطلوبہ پتے پر پہنچا دیا۔ یہ ایک کشادہ ولا تھا جس کی مالکہ نے اس کے کچھ کمروں کو گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر رکھا تھا۔ اکثر غیر ملکی طلباء اور سیاح اس سہولت سے استفادہ کرتے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کی ادھیڑ عمر مالکہ نے نوجوان جوڑے کا خوشدلی سے استقبال کیا۔ ان کے کمرے تک رہنمائی کی اور ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ یہ دونوں یہاں کی یونیورسٹی (Blekinge Tekniska B.T.H. hogskola) میں سافٹ ویئر انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔ سویڈن کی جن تین چار یونیورسٹیوں سے ان کو داخلے کا پروانہ ملا تھا۔ ان میں سے B.T.H کا انتخاب انہوں نے بڑے غور وخوض اور مشورے کے بعد کیا تھا۔ کمپیوٹر سائنسز کی تعلیم کے لئے یہ یونیورسٹی یورپ کی

پہلی تین یونیورسٹیوں میں سے ایک تھی۔

اگلے دن گیسٹ ہاؤس کی مالکہ سے راستے کے بارے میں جانکاری کر کے یونیورسٹی کے لئے روانہ ہوئے جو ایک کلومیٹر سے زیادہ دور نہ تھی۔ ہم وطن طلباء سے گرم جوشی کی توقع تھی جو مایوسی میں تبدیل ہوگئی۔ ان کی سمجھ سے باہر تھا کہ یہ لوگ ان کو عجیب سی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ مانا کہ وہ کچھ تاخیر سے پہنچے تھے۔ کلاسز دو ماہ پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ مگر ہم وطن محض اس وجہ سے تو گریزاں نہ ہو سکتے تھے۔ وہ بُری طرح الجھن کا شکار تھے کہ کچھ سرگوشیاں کانوں سے ٹکرائیں۔

''لڑکا تو پاکستانی ہے، مگر لڑکی اطالوی لگتی ہے''۔

''نہیں یار! میرا خیال ہے، مشرقی یورپ کے کسی ملک سے ہے''۔

''ٹرین میں دوستی ہوگئی ہوگی''۔

''ہاں بھائی! پاکستانیوں کو یورپ کی ہوا بڑی جلدی لگ جاتی ہے''۔

الجھن سلجھ گئی تھی۔

نوجوان اپنی ساتھی طالبہ کے ساتھ سرگوشیاں کرتے گروپ کی طرف بڑھا۔

''السلام علیکم! میرا نام عماد ہے اور یہ میری مسز ہیں، مریم۔ ہم یہاں سافٹ ویئر انجینئرنگ میں ماسٹرز کرنے آئے ہیں''۔

''ہائیں!'' حیرت اور بے یقینی کی ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔

''جی ہاں، ابھی چند ماہ پہلے ہماری شادی ہوئی ہے۔ اصل میں میرے والدین کو یورپ کے ماحول کے بارے میں تحفظات تھے۔ سو انہوں نے مریم کو میرے ساتھ نتھی کر دیا اور بے فکر ہوگئے''۔

''سوری بھائی! سوری بھابی! ہم کچھ اور سمجھے تھے''۔ گریزاں لہجوں میں شرمندگی در آئی تھی۔

آج آٹھ سال کے بعد وہ مجھے ساتھ لئے ایک بار پھر رونیبی کی طرف رواں

رواں تھے۔ جس کی دانش گاہ سے ڈگری لے کر نکلے تو سویڈن اور ڈنمارک کی سافٹ ویئر کمپنیوں نے اپنے دروازے ان کے لئے کھول دیئے تھے۔ عماد زمانہ طالب علمی کو یاد کرتے ہوئے خوبصورت منظروں میں گھرے راستوں پر گاڑی بھگائے لئے جاتا تھا۔ سفید اور سرمئی بادلوں میں کہیں کہیں آسمان کے نیلے پیوند لگے تھے اور طویل القامت درخت بادلوں میں سر گھسائے جانے کیا سرگوشیاں کرتے تھے۔

''ایسے میں ماں باپ بننے کی خبر نے ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا''۔ مریم بتا رہی تھی۔ ''ہم دونوں ماں باپ کے ہاتھوں کی چھاؤں میں رہنے والے لاڈلے بچے تھے۔ جنہوں نے کبھی ہل کر پانی بھی نہ پیا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک ننھے بچے کو سنبھالنے کے تصور سے ہی ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ مگر آپ نے اور میرے والدین نے ہمت بندھائی۔ اللہ کی مدد شامل حال رہی۔ اس کا لاکھ شکر، آپ نے صحیح کہا تھا کہ آنے والا اپنے نصیب ساتھ لائے گا۔ ڈگری اور بیٹا ساتھ ساتھ ہی ملے۔ ہم نے اپنے اوقاتِ کار تقسیم کر لئے تھے۔ کبھی عماد کلاس اٹینڈ کرتے اور میں طہٰ کے ساتھ ہوتی۔ کبھی میں طہٰ کو عماد کے سپرد کر کے کلاس لینے چلی جاتی تھی۔ کچھ مالی مشکلات بھی پیش آئیں، لیکن شکر ہے کہ تکلیف دہ اور سخت حالات کا دورانیہ کم رہا''۔ مریم روانی سے اپنی جدوجہد کی داستان سنائے چلی جاتی تھی۔

''جس شہر کے پاس سے اب ہم گزر رہے ہیں۔ یہ کارلس ہام (Karlsham) ہے''۔ عماد نے بتایا۔ ''ان دنوں بی ٹی ایچ کے کیمپس تین شہروں کارلس ہام، رونیبی اور کارلس کرونا میں قائم تھے۔ 2010ء میں رونے بی کیمپس کو کارلس کرونا کیمپس میں ضم کر دیا گیا۔ رونے بی کیمپس کی عمارت میں اب مہاجرین کی آبادکاری کے دفاتر قائم ہیں۔ یونیورسٹی ہاسٹلز کو مہاجرین کی رہائش گاہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے''۔

اگلی شرافت کے نمونے

عماد نے ہوٹل (Ronneby Brunn) کے سامنے گاڑی روک کر ہمیں اترنے کو کہا۔ ڈگی سے بیگز نکال کر باہر رکھے اور گاڑی پارک کرنے چلا گیا۔

"وقت کی کٹھن گھیریاں ہیں ساری"۔ خوبصورتی سے سجے استقبالیہ ہال کے آرام دہ صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے میں نے سوچا۔ جو مقام کبھی تصور سے نہ گزرے تھے وہاں حقیقت میں قدم پڑتے ہیں"۔

عماد گاڑی پارک کر کے آ گیا تھا۔ مریم نے استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود لڑکی کو اپنی بکنگ کا بتایا۔ سمارٹ اور خوبصورت ریسپشنسٹ دوشیزہ نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں، بکنگ کنفرم کرنے کے بعد ایک پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ چابیاں ہمارے حوالے کیں۔

تیسری منزل پر کشادہ اور پُر آسائش کمرہ ہمارا منتظر تھا جو دو عدد بیڈ ڈریسنگ ٹیبل، صوفہ سیٹ اور الماری سے مزین تھا۔ برقی کیتلی اور چائے کافی کے لوازمات میز پر دھرے تھے۔ روم سروس والی بی بی نے صوفے کو بیڈ میں تبدیل کرنے کا طریقہ بتایا اور ہمارے مطالبے پر ایک اضافی فولڈنگ بیڈ لا کر دیا۔ میں نے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور پٹ وا کر دئے۔ چمکیلی روشن دھوپ، ہوا کی ٹھنڈک آسمان کی دھلی ہوئی نیلاہٹ اور دور تک پھیلا سبزہ دیکھ کر سفر کی تھکان کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔

"ماما وہ پیلا گھر دیکھ رہی ہیں آپ؟" عماد میرے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ رونیبی میں ہمارا پہلا ٹھکانہ تھا۔ اس گھر کی مالکہ ایلی نور (Elenor) بہت اچھی خاتون ہیں۔ گئے وقتوں کی وضع دار لیڈی رالف کے ساتھ ازدواجی زندگی کے چالیس سال گزار چکی ہیں۔ گو کہ یہاں کے ماحول میں ایسی مثالیں کمیاب ہیں، مگر اگلی شرافت کے نمونے اب بھی پائے جاتے ہیں"۔

مجھے ایلی نور سے ملنے کا اشتیاق ہونے لگا۔عماد میاں کو متاثر کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔یقیناً اس لیڈی میں کوئی خاص بات ہوگی۔

''ہمارے آنے کے ایک ہفتے بعد انہوں نے بتایا کہ Stenboksvagen پر ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ خالی ہے، کرایہ بھی مناسب ہے، تم لوگ وہاں شفٹ ہو جاؤ۔ گیسٹ ہاؤس مہنگا ہے اور یہاں پرائیویسی بھی نہیں ہے''۔عماد نے بات جاری رکھتے ہوئے بتایا۔''وہ ایک کمرے کچن، باتھ روم اور سٹور پر مشتمل مناسب سا اپارٹمنٹ ہمیں پسند آ گیا۔ یونیورسٹی سے دس منٹ اور سنٹرم (Centrum) سے پانچ منٹ کی پیدل مسافت پر تھا۔ ہم نے فلی مارکیٹ سے فرنیچر اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید کر اس کو آراستہ کر لیا''۔

''ماما کو یہ بھی تو بتائیں کہ ہم روٹی کیسے پکاتے تھے''۔مریم ہنستے ہوئے ہماری گفتگو میں شامل ہوگئی۔''یہاں تو انہیں ملتا تھا۔ہم فرائنگ پین میں روٹی پکاتے تھے''۔ہم سب مسکرانے لگے۔ضرورت انسان سے کیا کیا کراتی ہے۔

بچے سوئمنگ پول پر جانے کے لئے اتاولے ہو رہے تھے۔مریم نے ان کے تیراکی کے لباس نکالے اور ہم سب نے سوئمنگ پول کا رُخ کیا۔ہوٹل کے وسیع وعریض کمپاؤنڈ میں گھاس کا سبز قالین بچھا تھا۔کئی حصوں پر مشتمل سوئمنگ پول خوبصورت نظاروں میں گھرا تھا۔گھاس کے خوبصورت قطعے پولز پر بنی ہوئی لکڑی کی چھوٹی چھوٹی پلیوں کے ذریعے آپس میں ملحق تھے۔عماد اور بچے پانی میں اُتر گئے اور میں مریم کے ساتھ پلی پر کھڑی ہو کر ان کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہاں میں نے پہلی دفعہ برکینی میں ملبوس خواتین کو دیکھا۔جو کوئی بھی اس لباس کا موجد ہے، بجا طور پر تحسین کا مستحق ہے۔یہ لباس چہرے اور ہاتھ پاؤں کے علاوہ پورے بدن کو ڈھانپ لیتا ہے۔اس کو پہن کر بلا جھجک تیراکی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

ہماری ننھی گڑیا رجاء پانی میں کھیلنے کی بے حد شوقین واقع ہوئی ہے۔اس کو سوئمنگ

پول سے باہر نکلنے پر آمادہ کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ایک دفعہ ڈوبتے ڈوبتے بچی، پانی میں دو چار غوطے کھالئے مگر مجال ہے جو خوفزدہ ہوئی ہو۔اس شام شہر گھومنے کا پروگرام تھا، سو بمشکل کھینچ کھانچ کر صاحبزادی کو پانی سے نکالا اور عماد روتی بسورتی کو گود میں اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔

رونے بی باغ سویڈن

اقبال نے کہا تھا:

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

حسن بے پروا کو انسانی ہاتھوں نے سنوارا تو اس نے شہر کو وہ چھل بل عطا کی کہ دنیا سے سویڈن کے باغ کا دل (Heart of the Garden of Sweden) کا لقب پایا۔سرسبز درختوں میں گھرا نیم پہاڑی علاقہ، درمیان میں بہتی ہوئی نہر پر بنی ہوئی خوبصورت طرح دار پلیاں جن کی ریلنگ کے ساتھ پھولوں بھری ٹوکریاں لٹک رہی تھیں، سڑکوں کے ساتھ چلتی گرین بیلٹس پر سرخ سیبوں سے لدے درخت، اتنے حسن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے عمر چاہئے، دو گھڑی کی چاہت میں کیا کیا کھل پاتا؟ اپنی تہی دامنی کا شدت سے احساس ہوا۔شاعرہ ہوتی تو لفظوں سے تصویر کھینچ کر رکھ دیتی۔

اگلے دن برونس پارک کی سیر کا پروگرام تھا۔مریم کا خیال تھا کہ مجھے ایک آرام دہ جوتی خرید لینی چاہئے، تاکہ برونس پارک میں پہاڑی کی چوٹی پر واقع جھیل کا نظارہ کرنے آسانی سے پہنچ سکوں۔عماد ہمیں مشہور سٹور (ICA Maxi) پر لے آیا۔میں جوتے کو ریک سے اٹھا کر الٹ پلٹ کر قیمت کا ٹیگ دیکھتی اور اس کو بارہ سے ضرب دے کر روپوں میں تبدیل کرتی اور چپکے سے واپس رکھ دیتی۔عماد گولڈن اور چھدرے بالوں والے سولہ سترہ سالہ لم ڈھینگ سے لڑکے کی طرف متوجہ تھا۔

''مریم! یہ ژولیان ہے نا؟'' عماد مریم سے پوچھ رہا تھا۔''لِو (Liv) کا بیٹا جو ہمارے نیچے والے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی؟''

ژولیان نے بھی عماد کو دیکھ لیا تھا۔''ہائے عماد! تم تو مالمو چلے گئے تھے نا، رونیبی کب آئے؟''

''آج ہی آیا ہوں''۔عماد نے جواب دیا۔''تم کیسے ہو؟ بڑے ہو گئے ہو، جب میں یہاں سے گیا تھا تو تم دس گیارہ سال کے تھے۔Liv کیسی ہے؟''

''مام ٹھیک ہے، مجھے اس کا نیا بوائے فرینڈ بالکل پسند نہیں، سو میں کارلسکرونا چلا گیا۔ویک اینڈ پر مام سے ملنے آجاتا ہوں''۔

''کارلسکرونا میں اپنے باپ کے پاس رہتے ہو؟'' عماد نے پوچھا۔

''اوہ نو، وہ تو خود ایک موٹی سی خوفناک عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ میں وہا دوستوں کے ایک گروپ کے ساتھ ہوں۔ہم لوگ گھروں میں اشتہار ڈالنے کا کام کرتے ہیں۔گزارے کے لئے رقم کما لیتے ہیں''۔

''توں آپ وی تے کنفرم حرام دا ایں''۔عماد پنجابی میں بڑبڑایا۔

''کیا کہا؟'' ژولیان پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں، اپنی مام کو تمہارے بارے میں بتا رہا تھا''۔

میں اور مریم منہ موڑ کر مسکرانے لگے۔

''لیجئے ماما! ایک جنکی (Juny) نمونہ بھی آپ نے ملاحظہ کر لیا''۔ژولیان کے جانے کے بعد عماد میری طرف متوجہ ہوا۔''اور ہاں آپ نے جوتی پسند کی یا ابھی تک ضرب تقسیم کے چکر میں ہیں؟''

''دیکھو نا، کوئی سادہ سی جوتی بھی تین چار ہزار سے کم میں نہیں مل رہی''۔

''ماما! میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ کرونے کے روپے مت بنائیں۔اس طرح تو آپ کچھ بھی نہ لے پائیں گی''۔عماد نے ریک سے ایک جوتی منتخب کر کے میری

طرف بڑھائی۔ ''اس میں پاؤں ڈال کر دیکھیں۔ اگر آرام دہ ہے تو میں آپ کے لئے لے رہا ہوں'' اس کا انداز قطعی تھا۔

جوتی خرید کر نکلے تو سنٹرم (Centrum) کو روانہ ہوئے جو وہاں سے قریب ہی تھا۔ سب لوگ بھوک محسوس کر رہے تھے۔ عماد اور مریم کے زمانہ طالب علمی کے حلال ریسٹورنٹ کا نام اور انتظامیہ دونوں بدل چکے تھے، اب وہ حلال ریسٹورنٹ نہ رہا تھا۔

طٰہٰ صاحب ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہو کر اپنی مختصر سی ناک سکوڑ کر گہرے گہرے سانس لے رہے تھے'' ۔"Papa it smells yummy"

''چلو نکلو باہر، یہ حلال نہیں ہے'' ۔عماد نے اس کو گھر کا۔

''ایک لبنانی ریسٹورنٹ بھی تھا عماد!'' مریم نے یاد دلایا۔

''چلو اس کو دیکھ لیتے ہیں'' ۔عماد یہ کہتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا اور ہم بھی اس کے پیچھے ہو لئے۔ سامنے ایک نیون سائن جگمگا رہا تھا، جس پر پیزا کباب کے الفاظ لکھے نظر آتے تھے۔ ہم عماد کی معیت میں اندر داخل ہوئے۔ ریستوران کے لبنانی مالک حسن نے عماد کو پہچان کر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

''مام! پاکستان سے آئی ہیں'' ۔عماد نے اس کو بتایا۔ ''وہ رونیبی دیکھنا چاہتی تھیں، ان کو ساتھ لائے ہیں'' ۔

''السلام علیکم!'' ۔وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا جھکا۔ ''میں حسن ہوں'' ۔

''وعلیکم السلام! کیف انت یا اخی؟'' میں نے مدتوں سے سنبھالی ہوئی فینائل زدہ عربی کو ہوا لگوانا ضروری سمجھا۔

''کوئز، الحمد اللہ!'' حسن نے جواب دیا اور عماد کو دکھڑا سنانے لگا۔ ''تم مام کو رونیبی دکھانے لائے ہو۔ دیکھ لو خالی پڑا ہے۔ جب یہاں یونیورسٹی کا کیمپس تھا تو بہت رونق ہوتی تھی۔ شام کے وقت طلباء کی ٹولیاں گھومتے پھرتے دکھائی دیتی تھیں۔ اکثر طالب علم کھانے پینے کے لئے ریستورانوں کا رُخ کرتے تھے، اب تو یہاں معاشی سرگرمی

بہت کم رہ گئی ہے"۔ وہ بجا طور پر پریشان تھا۔

کھانے کا معیار اور مقدار دونوں خوب تھے۔ ہم کھانے کے بعد حسن کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو شام پر پھیلا رہی تھی۔ (Handels bank) کے عقب میں سفید رنگ کا گرجا گھر راج ہنس کی مغرور گردن کی صورت بلند ہوتا تھا۔ گرجا قدرے اُونچائی پر واقع تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے بنک کی عمارت کے پہلو سے سیڑھیاں اُوپر جاتی تھیں۔

"یہ چرچ آف ہولی کراس ہے"۔ عماد نے بتایا۔ "1564ء میں یہاں شدید خوں ریزی ہوئی تھی۔ اس وقت کی یادگار ایک دروازہ جس پر کلہاڑوں کے نشانات ہیں، اس چرچ میں ابھی تک محفوظ ہے"۔

رونے بی کا خونی غسل

یہ صاف ستھرا پُرسکون پھولوں بھرا سرسبز شہر خون رنگ تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ سات سالہ شمالی جنگ (Seven years nordic war) جس میں سویڈن کا بادشاہ ایرک چہاردہم، ڈنمارک ناروے اور پولینڈ کی متحدہ طاقت سے برسرپیکار تھا۔ 1563ء سے 1570ء تک لڑی گئی۔ رونیبی ان دنوں ڈنمارک کے زیرنگیں تھا۔ ایرک چہاردہم کی فوجوں نے شہر کا محاصرہ کرلیا اور وسیع پیمانے پر قتل وغارت کا بازار گرم کردیا۔ انسانی خون کی اس ارزانی کو (Ronneby Blood Bath) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایرک چہاردہم کا یہ قول تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ "سمندر کا پانی ڈنمارکیوں کے خون سے زیادہ سرخ تھا"۔

تو کیا یہ انسانی خون کا رنگ تھا جو رونیبی کے لالہ وگل میں نمایاں تھا؟ کیا تعمیر وترقی کی جڑیں تباہی وخوں ریزی سے پھوٹتی ہیں؟ جاپان کے ایٹم بموں سے جھلسے وجود سے نیا جاپان جنم لیتا ہے اور صنعتی میدان میں بڑے بڑوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیتا ہے۔ جرمنی، فرانس، انگلستان اور ہالینڈ دو بڑی جنگوں کے دوران بھوک ننگ اور جانوں کا ضیاع سہنے

کے بعد چند برسوں میں پہلے سے بہتر رنگ وروپ پا لیتے ہیں۔

اگر ایسا ہے تو یہ کلیہ میرے وطن کی سرزمین پر کیوں لاگو نہیں ہوتا؟ 1947ء کی خون آشام ہجرت سے لمحہ موجود تک کتنا لہو دھرتی میں جذب ہو چکا، مگر وطن کے عارض بے رنگ گلنار نہ ہوئے۔

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

جواب صاف اور واضح ہیں وطن کی رگوں میں پیوست ظلم، ناانصافی اور استحصالی طاقتوں کے پنجوں کو اکھیڑ کر نکالنے کے لئے جس خود افروزی اور جگر سوزی کی ضرورت ہے وہ ہم میں ناپید ہے۔ سوکل کے غم وعیش پر ہمارا کیا حق؟

سنٹرم میں بنے ہوئے پبلک ٹائلٹ کو دیکھ کر عماد کچھ یاد کر کے مسکرانے لگا۔

''ماما! یہ ٹائلٹ دیکھ رہی ہیں آپ؟ اس کو استعمال کرنے کے لئے دروازے کے ساتھ بنے ہوئے خانے میں پانچ کرونے کا سکہ ڈالنا پڑتا ہے، تب دروازہ کھلتا ہے اور باہر آنے پر خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ ہمارے دوستوں نے ایسی تکنیک ایجاد کی تھی کہ پانچ کرونے کا سکہ ڈالتے اور دس بارہ لوگ مستفید ہوتے''۔

''وہ کیسے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ اس طرح کہ جو پہلے سکہ ڈال کر اندر جاتا وہ باہر آنے پر دروازہ بند نہ ہونے دیتا اور دوسرا اندر داخل ہو جاتا۔ دوسرے کے باہر آنے پر تیسرا اور پھر چوتھا، باری باری سب فارغ ہو جاتے''۔

''اف توبہ!'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''کتنے زرخیز بلکہ فتنہ خیز دماغ ہیں تم لوگوں کے۔ صحیح کہا تھا، شیخ سعدی نے کہ مکتب کے لونڈوں کی شرارتوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے''۔

واپسی پر عماد ہمیں (Stenbocksvagon) پر وہ گھر دکھانے لے گیا۔

جہاں وہ زمانہ طالب علمی میں مقیم رہے۔ یہ ایک تین منزلہ ولا تھا جس کے تینوں حصوں میں الگ الگ کرائے دار مقیم تھے۔ تیسری منزل پر واقع حصہ جو ایک کمرے، کچن، باتھ روم اور سٹور پر مشتمل تھا، وہاں ان کا طالب علمی کا دور گزرا تھا۔

سافٹ سینٹر کے قریب ہرے بھرے میدانوں اور بلند درختوں میں گھری B.T.H کی عمارتوں میں اب مہاجرین کی آبادکاری کے دفاتر قائم تھے۔ قریبی پہاڑی پر واقع یونیورسٹی ہاسٹلز مہاجرین کی رہائش گاہوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ عماد گاڑی اُوپر لے گیا۔ ہاسٹلز کے لان میں پڑی ہوئی بچوں کی سائیکلیں کھلونے، فٹ بال وغیرہ تبدیلی کی داستان سناتے تھے۔

اگلے دن ناشتہ ہوٹل کی طرف سے تھا۔ اتنے بڑے ہوٹل میں بفے (Buffet) ہال تلاش کرنا مشکل مرحلہ تھا۔ مگر عماد ہمیں مختلف راہداریوں سے گزارتے کبھی سیڑھیاں اترتے اور کہیں لفٹ سے اُوپر جاتے ہوئے آخرکار مطلوبہ ہال تک لے آیا۔ طرح طرح کی بریڈ، مکھن، پنیر، سپریڈز، سیریلز، کئی ذائقوں میں دستیاب دہی، دودھ، تازہ جوسز، آملیٹ، چائے، کافی، غرض کہ ناشتے کی بے شمار ورائٹی تھی۔

''ماما! آپ کچھ بھی لے سکتی ہیں، سوائے ان چیزوں کے''۔ مریم نے ایک میز پر رکھی قابوں کی جانب اشارہ کیا۔ ''ان میں پورک ہے اور جو چکن وغیرہ ہے وہ بھی ذبیحہ نہیں ہوگا''۔

میں کارن فلیکس، اورنج جوس اور دو اُبلے ہوئے انڈے لے کر کھڑکی کے پاس والی میز پر آ گئی، جہاں عماد اور بچوں نے پہلے سے قبضہ کر رکھا تھا اور کھڑکی کے شیشوں کے اس پار گھنے درختوں کا جنگل تھا

رونیبی برونس پارک

سوا ایکڑ رقبے پر مشتمل رونیبی برونس پارک (Ronneby Brunns Park) کی ہری بھری وسعتوں کے بیچ میں کسی سحرزدہ کی مانند کھڑی تھی۔ میرے سامنے

آبشار سے گرتا ہوا پانی پہاڑی کے قدموں میں بنی چھوٹی سی شفاف ندی میں بہتا تھا۔ ندی میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں پر کھڑے نوجوان لڑکے لڑکیاں پہاڑی آبشار کو پس منظر میں رکھتے ہوئے سلفیاں لیتے تھے۔ قریب سے گزرتی ہوئی بجری کی روش پر چلنے والوں کے بچے والدین سے ہاتھ چھڑا کر ندی کے گرد پھرنے والی بطخوں کے پیچھے بھاگتے تو وہ قیں قیں کرتے ہوئے پانی میں کود جاتیں۔ گلابی، کاسنی، نارنجی، لال، نیلے، پیلے پھولوں سے کیاریاں لدی پڑی تھیں۔ قدیم گھنے درختوں کی بلند بانگ چوٹیاں آسمان کی نیلاہٹوں سے راز و نیاز کرتی تھیں۔ "المصور" کی صورت گری کے سامنے دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ پینٹنگ بھی ہیچ تھی۔ فطرت کا حسن بیچ شہر کے بے حجاب تھا۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں گلشن میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

(لفظ "صحرا" کو گلشن میں بدل دینے پر روح اقبال سے معذرت) گھنے درختوں میں گھری کون نما چھتوں والی ڈائریکٹرز وِلا (Directors Villa) کی زرد عمارت اسرار میں ڈوبی محسوس ہوتی تھی۔

1705ء میں رونیبی میں معدنی پانی کے چشموں کی دریافت کے بعد لوگ دور دور سے صحت بخش غسل کے لئے یہاں آنے لگے۔ انیسویں صدی ک اواخر میں ایک ڈینش لینڈ سکیپ آرکیٹکٹ نے برونس پارک کی بنیاد رکھی، جس نے جلد ہی پورے یورپ میں Spa Resort کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ 1980ء میں سویڈن کے مشہور لینڈ سکیپ آرٹسٹ انگوار اینڈرسن نے پارک کو نئے سرے سے آراستہ کیا اور اس میں (Rose garden, Water garden, Japanese garden) کا اضافہ کیا۔ پارک کو موجودہ ہیئت کے مطابق 1980ء میں بنایا گیا تھا۔ 2005ء میں

برونس پارک سویڈن کا پہلا اور یورپ چوتھا خوبصورت ترین پارک قرار پایا۔ سوا ایکڑ پر پھیلے پارک میں سولہ قدیم عمارتیں ہیں جن میں اب یوتھ ہاسٹل، ریستوران، عجائب گھر اور سٹاف کی رہائش گاہیں قائم ہیں۔ پورے پارک کو دیکھنے کے لئے رونیبی میں کم از کم ایک ہفتے کا قیام ضروری ہے۔

برونس پارک میں پہاڑی پر واقع جھیل تک پہنچنے کے لئے جنگل میں سے گزرتی ہوئی ڈھلوان پگڈنڈی پر دو کلومیٹر تک پیدل چلنا پڑا۔ جھیل کے اُوپر بنے ہوئے لکڑی کے چھجہ نما عرشے پر لگے بنچ پر بیٹھ کر سانس درست کئے۔ اردگرد کا نظارہ دل و نگاہ کو فرحت بخشتا تھا۔ تیز ہوا جھیل کے ٹھہرے پانی میں لہریں پیدا کرتی تھی اور کناروں پر جھکے درختوں کا عکس پانی میں ہلکورے لیتا تھا۔ برونس پارک میں گھومتے پھرتے سیاحوں کی کثرت دیکھ کر بار بار یہ خیال آتا رہا کہ کاش میرے ملک میں امن و امان کی صورتِ حال بہتر ہو۔ شمالی علاقہ جات کی بے مثال حسن کی مالک جھیلوں تک رسائی آسان ہو۔ سیاحت کا محکمہ اپنے کام درست طریقے پر انجام دے تو میرا پیارا پاکستان دنیا بھر کے سیاحوں کے لئے پُرکشش ترین ملک کا درجہ حاصل کرسکتا ہے۔ تھوڑی دیر یہاں رکنے کے بعد واپسی کا قصد کیا۔ پہاڑی کے پہلو میں قدرے اترائی پر ہموار میدان میں ہوٹل رونیبی برونس کا ٹینس کورٹ دکھائی دیتا تھا۔

چونکہ یہ دن اتوار کا تھا، برونس پارک میں ایک بڑی فلی مارکیٹ لگی ہوئی تھی۔

''آؤ مریم! چل کر دیکھتے ہیں''۔ میں نے کہا۔ مریم تو جھٹ سے تیار ہوگئی، مگر عماد بگڑنے لگا۔

''دفع کریں یہ کوئی دیکھنے کی چیز ہے، وقت ضائع کرنے والی بات ہے''۔

مگر میں عماد کی ناراضگی کو نظر انداز کرتے ہوئے مریم کو ساتھ لے کر فلی مارکیٹ میں گھس گئی۔

''کیا کریں گی یہاں آپ، آپ کے کام کی کوئی چیز ادھر نہیں ملتی''۔ عماد

بڑبڑاتے ہوئے ہمارے ساتھ ہولیا۔

سٹالز پر ہر طرح کی چیزیں تھیں، کپڑے، کھلونے، بیڈ شیٹس، برتن، ڈیکوریشن پیسز، موبائل، کیمرے، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، باورچی خانے میں استعمال ہونے والے گرائنڈر بلینڈر، جوسر، ٹوسٹر، مگر ہر چیز استعمال شدہ تھی۔ ایک سٹال پر کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس رکھے تھے۔ ایک چھوٹے سے کرسٹل گلدان کی قیمت پوچھی۔

"Thirty Karone (تھرٹی کرونے) سٹال والی بی بی نے مخصوص لہکتے ہوئے سویڈش لہجے میں جواب دیا"۔

لو بھلا، چھوٹا سا سیکنڈ ہینڈ گلدان اور تھرٹی کرونے، ہونہہ...... میں بڑبڑاتے ہوئے گلدان واپس رکھ کر چلنے لگی تو وہی لہکتی ہوئی آواز دوبارہ سماعت سے ٹکرائی۔ "ٹوئنٹی کرونے"۔

بی بی غالباً ہمارے پٹھان بھائیوں جیسی تاجر تھی، جو قالین کی قیمت پانچ ہزار بتا کر پندرہ سو میں فروخت کر دیتے ہیں۔ عماد نے اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں رُک نہ جاؤں میرا بازو پکڑ کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

فلی مارکیٹ کے باہر ایک عمارت میں چھوٹا سا عجائب گھر بنا ہوا تھا۔ یہاں ایک طرف لکڑی کی بڑی بڑی چرخیوں پر مشتمل قدیم آب پاشی سسٹم ڈسپلے کیا گیا تھا۔ بچے مچھلیوں کے ایکوریم کو دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ شیشے کے شوکیسوں میں سمندری جانوروں کے ڈھانچے محفوظ کیے گئے تھے اور حنوط شدہ پرندے دیواروں پر آویزاں تھے۔ قدیم وائی کنگز کی مخصوص لمبی کشتیوں کے ماڈل بھی رکھے تھے۔

میوزیم سے باہر نکل کر ذرا آگے کو چل دیئے۔ ایک عمارت کے ماتھے پر جلی حروف میں (Badhus No.1) کے الفاظ چمک رہے تھے۔ یہ "بیڈہس" کیا ہوا بھئی بُرا گھر؟ کیا یہ کوئی آسیب زدہ گھر ہے؟ طٰہٰ صاحب اپنی دادو کی اس جاہلانہ گفتگو پر دانت نکالنے لگے۔

"دادو! یہ بیڈ ہکس انگلش میں باتھ ہاؤس ہے"۔

یہ کوئی (Haunted House) نہیں ہے۔

ماما یہ یہاں کا قدیم پبلک باتھ ہاؤس ہے جو 1876ء میں بنا۔ اس میں چوبیس غسل خانے ہیں۔ عماد نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ یہ اپنے وقت کے نسبتاً اعلیٰ طبقے کے استعمال کے لئے بنایا گیا تھا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ یہ تو طے ہے کہ پورا پارک دیکھنا ناممکن ہے۔ جتنا دیکھ لیا کافی ہے۔ ابھی ہمیں کارلسکرونا جانا ہے۔ عمران بھائی اور زونیا سے ملنے اور پھر مالمو واپسی کے لئے نکلنا ہے۔ گھر پہنچنے تک رات ہو جائے گی"۔

مریم کی بات ٹھیک تھی۔ ہم واپسی کے لئے مڑ گئے۔ ہوٹل واپس جا کر منہ ہاتھ دھوئے، خود کو تر و تازہ کیا۔ سامان صبح ہی پیک کر کے رکھ لیا تھا۔ چیک آؤٹ کرنے کے بعد سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھا اور کارلس کرونا کے لئے روانہ ہو گئے، جہاں عماد B.T.H کا کلاس فیلو عمران اس کی بیوی زونیا اور دو پیارے پیارے بچے سکینہ اور یحییٰ ہمارے منتظر تھے۔

برونس پارک ـ حسن فطرت شہر میں بے حجاب ہے (۱)

برونس پارک ۔حسن فطرت شہر میں بے حجاب ہے (۱)

جہیل آبشار اور ڈائرکٹر ولا (۱)

ڈنمارک کے دیہات (۵)

نوئن ویلج میں گھروں کے اندرونی مناظر (۱)

پانی میں بکھرا شہر

ایسا انوکھا شہر زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

تیس کے قریب چھوٹے بڑے جزائر پر مشتمل غیر معین شکل کا شہر کارلسکرونا یعنی کارل کا تاج......شمالی سویڈن کے صوبہ بلیکینگے (Blekinge) کا سب سے بڑا شہر جو کسی زمانے میں محض کھیتوں اور چراگاہوں پر مشتمل تھا اور پھر سترہویں صدی کے اواخر میں سویڈش بحریہ کا ہیڈ کوارٹر سٹاک ہوم سے یہاں منتقل کر دیا گیا۔ غالباً کسی اہلِ نظر جرنیل کی فراست نے ان جزائر کی دفاعی حیثیت کا ادراک کر لیا تھا۔ ڈنمارک اور جرمنی سے کم بحری فاصلے پر واقع یہ علاقہ جنگی حکمتِ عملی کے لحاظ سے بہترین محل وقوع کا حامل تھا۔ نیول بیس (Neval Base) کے قیام کے بعد یہاں ہزاروں لوگوں کو روزگار ملا اور چھوٹا سا زرعی قصبہ ایک بڑے اور ترقی یافتہ شہر میں تبدیل ہو گیا۔ تیس جزائر میں سے ایک (Stumholmen) نیوی کی ملکیت تھا جہاں اب نیشنل نیول میوزیم قائم ہے۔

ہماری منزل شہر کا سب سے بڑا اور مرکزی حیثیت کا حامل جزیرہ ٹروسو (Trosso) تھی۔ گاڑی سمندر کے ساتھ ساتھ ساحلی شاہراہ پر چلتے ہوئے چھوٹے سے پُل سے گزر کر ایک سے دوسرے جزیرے میں داخل ہو جاتی۔ جزائر کے ساحلوں سے لگی چھوٹی بڑی رنگ برنگی موٹر بوٹس کے عکس شفاف پانیوں میں ہلکورے لیتے تھے۔ نیلے پانی پر بے ترتیبی سے پھیلے سرسبز جزیروں پر بلند ہوتی قدیم اور جدید عمارتیں ماحول کو فیری ٹیلز کی

سی فسوں خیزی اور رومانویت عطا کرتی تھیں۔

ٹروسو کے ساحل کے سامنے دائیں بائیں پھیلا ہوا سرسبز پہاڑی جزیرہ کھلے سمندر میں بلند ہوتا تھا۔ برسوں پہلے سند باد جہازی شاید ایسے ہی کسی جزیرے پر اترا تھا جو درحقیقت مدتوں سے سوئی ہوئی دیو ہیکل مچھلی تھا۔ جس کے وجود پر چڑھی ہوئی مٹی کی تہوں پر سبزہ اُگ آیا تھا۔ لوگوں کے چلنے پھرنے سے مچھلی کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے حرکت کی اور سند باد جہازی اور اس کے ساتھی پانی میں غوطے کھانے لگے۔ کیا مزے کی کہانی تھی۔ فیری ٹیلز کے ماحول میں فیری ٹیلز یاد آتی تھیں۔ شمالی سویڈن کا سب سے بڑا شہر ہونے کے باعث کارلسکرونا کی تجارتی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ بڑی کمپنیوں مثلاً ایرکسن، ٹیلی نار وغیرہ کے علاقائی ہیڈکوارٹرز بھی یہاں قائم ہیں۔

عمران اور زونیا نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ طٰہٰ اور رجاء بھی ان کے بچوں سے مل کر خوش ہوئے۔ زونیا نے کھانے پر کافی اہتمام کر رکھا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ان کے ساتھ گزارنے کے بعد اجازت لی۔ میں شہر کا مرکزی سکوائر (Centrum) دیکھنا چاہتی تھی، کیونکہ کسی بھی شہر کا اصل کلچر سنٹرم میں ہی نظر آتا ہے۔ کارلسکرونا کا سنٹرم شہر کے نسبتاً بلند مقام پر واقع ہے۔ یہ سویڈن کا سب سے بڑا سٹی سینٹر ہے۔ پتھریلے فرش والے وسیع سکوائر کے درمیان کنگ کارل XI کا مجسمہ ایک بلند چبوترے پر نصب ہے، جس کے نام پر یہ شہر کارلسکرونا کہلایا۔

سکوائر میں بنی ہوئی بیشتر عمارتیں اور چرچ بیروک (Barouqe) طرزِ تعمیر کی حامل ہیں جو سترہویں اور اٹھارویں صدی میں یورپ کے طبقہ اشرافیہ کا مقبول طرزِ تعمیر تھا۔ (Baroque) عمارتیں قدرے منقش ہیں اور اشرافیہ کی مخصوص فاتحانہ شان و شوکت، وقار، غلبہ اور طاقت کی مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورتی اور دلآویزی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ کارلسکرونا بیروک عمارتوں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے۔ سترہویں صدی کے اواخر میں شہر کو جس ہیئت پر تعمیر کیا گیا تھا اس میں زیادہ تبدیلیاں نہیں کی گئیں اور شہر کا

بیشتر حصہ یونیسکو کے عالمی ورثے میں شامل ہے۔

رونیبی کے برعکس کارلسکرونا کا سنٹرم گنجان اور پُر رونق دکھائی دیتا تھا۔ ریسٹورنٹ اور شاپنگ مالز لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ریلوے سٹیشن اور سنٹرم کے درمیان گھنے درختوں، رنگ برنگے پھولوں فواروں اور (Sclptures) سے سجا وسیع (Hogland Park) تھا۔

''زمانہ طالب علمی میں ہم یونیورسٹی کے (Travell Pass) پر کارلس ہائم، رونیبی اور کارلسکرونا کے درمیان مفت سفر کر سکتے تھے''۔ عماد بتا رہا تھا۔ ''ہماری تفریح یہی ہوتی تھی کہ ٹرین پر بیٹھ کر کارلسکرونا کارلس ہائم چلے جائیں۔ یوں ہم پیسے خرچ کئے بغیر گھوم پھر لیتے تھے''۔

(Hogland Park) کو سرسری سا دیکھنے کے بعد ہم نے واپسی کی راہ لی۔ شام تک ہمیں واپس مالمو پہنچنا تھا۔ سترہ اٹھارہ گھنٹے طویل دن ہمارے خوب کام آتا تھا۔

خوبصورت ایمپوریا مال میں بدصورت منظر

واپسی کے دن قریب تھے اور ہمارے ننھے میاں طٰہٰ صاحب شکوہ کناں تھے کہ دادو کو ان کے پسندیدہ مقامات ابھی تک نہیں دکھائے گئے تھے۔ جن میں ایمپوریا شاپنگ مال سرفہرست تھا۔

''اب ہم مالمو سے باہر نہیں جائیں گے''۔ میں نے طٰہٰ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''اب ہم صرف وہاں جائیں گے جہاں ہمارا شہزادہ ہمیں لے جانا چاہے گا''۔

''تو پھر کل ہم ایمپوریا جا رہے ہیں''۔ اس نے پُر جوش انداز میں اعلان کیا۔

ایمپوریا کے کئی منزلہ پارکنگ لاٹ کی ٹرانسپیرنٹ دیواریں لال نیلی ہری روشنیوں میں رنگی دکھائی دیتی تھیں اور سامنے راؤنڈ اباؤٹ کے بیچ غیر معمولی جسامت کا پتھریلا انسانی چہرہ منہ سے مسلسل پانی اگل رہا تھا۔ گاڑی اس منفرد فوارے کے گرد چکر لگا کر رنگیں روشنیوں

سے سجے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوگئی۔ عماد نے پہلے فلور پر گاڑی پارک کردی۔

''کافی بڑا پارکنگ لاٹ ہے''۔ میں نے گاڑی سے نکلتے ہوئے کہا۔''ہزاروں گاڑیوں کی گنجائش ہوگی''۔

''جی ماما!'' مریم نے بتایا۔''یہاں 3500 گاڑیاں بیک وقت پارک کی جاسکتی ہیں''۔

''دادو! آپ میرے ساتھ آئیں، ہم واٹر فال لفٹ سے اُوپر جائیں گے''۔ آج کے دن طٰہٰ ہمارا گائیڈ ٹھہرا تھا، سو پیچھے اس امام کے جائے بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ ایک شیشے کی بنی ہوئی لفٹ تھی، جس کی شفاف نیلی دیواروں پر باہر کی جانب پانی ایک آبشار کی صورت بہتا تھا۔

''اچھی ہے نا دادو؟'' وہ پُر جوش معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

''بہووت اچھی ہے''۔ میں نے ''بہت'' کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔''تھینک یو آپ مجھے یہاں لائے''۔ اس کی لمبی پلکوں والی خوبصورت آنکھوں میں جگنو چمکتے تھے۔

چار منزلہ بلند عمارت کا ہر فلور ستائیس ہزار میٹر وسیع تھا۔ شیشے کے گنبد والی چھت سے قدرتی روشنی اندر آتی تھی اور اُوپر سے نیچے کو لٹکتی سرسبز بیلیں تازگی کا تاثر اُجاگر کرتی تھیں۔ ملبوسات، کاسمیٹکس، جیولری، ڈیکوریشن، سووینیئرز، ہاؤس ہولڈز اور کھلونوں کی دکانوں کے علاوہ پلے ایریاز، ریسٹوران اور آئس کریم پارلرز پر بھی لوگوں کا رش لگا تھا۔

''ماما اس عمارت کی چھت پر بہت بڑا روف ٹاپ پارک (Rooftop Park) ہے۔ جہاں سے شہر کا نظارہ بہت دلکش نظر آتا ہے۔ پہلے آپ یہاں سے فارغ ہوجائیں، پھر اُوپر جائیں گے''۔ عماد نے بتایا۔

سویڈن کا معروف برانڈ سٹور H&M میرا اور مریم کا پسندیدہ برانڈ سٹور تھا، کیونکہ یہاں ہر چیز مناسب قیمت میں دستیاب تھی۔ میں صغریٰ کے لئے جیکٹ خریدنا چاہتی تھی، جس کی اس نے خاص طور پر فرمائش کی تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی ایک شرمناک واقعے

نے میرا موڈ بُری طرح تباہ کر کے رکھ دیا۔

وہ ایک عرب خاندان تھا جو اہل مغرب سے زیادہ مغربی بننے کے جنون میں مبتلا دکھائی دیتا تھا۔ عورت چست جینز اور مخصوص انداز کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھی، جس میں ایک شانہ عریاں دکھائی دیتا تھا۔ برمودا نیکروں اور بغیر بازوؤں کے ٹی شرٹس پہنے ایک مرد اور بارہ تیرہ سالہ ہونق چہرے والا لم ڈھینگ سا لڑکا اور ایک لڑکی جو زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سال کی تھی۔ لڑکے کے ہاتھ میں غیر معمولی بڑے سائز کی آئس کریم کون تھی، جب کہ لڑکی ایک چھوٹا سا کپ لئے ہوئے تھی جس میں سے اس کا حریص بھائی چمچ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی کے احتجاج کرنے پر ہونق چہرے والے لڑکے نے اس کے پیٹ میں ایسا ٹھڈا رسید کیا کہ بے چاری ننھی بچی پیٹ پکڑ کر وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ ستم بالائے ستم کہ ان کی ماں بے دردی سے بچی کا بازو کھینچ کر اُٹھاتے ہوئے اسی کو ڈانٹتے چلی جاتی تھی۔ جب کہ وہ حریص لم ڈھینگ دانت نکوستے ہوئے باپ کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔

میرے وجود میں جیسے انگارے بھر دیئے گئے۔

"جاہل، بے حس ظالم لوگ!" میں نے اس جاتے ہوئے خاندان کی طرف دیکھ کر کہا۔ میری آواز شاید زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ عماد جلدی سے میری طرف لپکا اور کندھوں سے تھام کر قریب پڑے صوفے پر بٹھا دیا۔

"پلیز ماما! ریلیکس ہو جائیں"۔ مریم میری کمر سہلانے لگی۔

"دیکھو ذرا ان لوگوں کو، یہ آج بھی وہیں ہیں"۔

میں نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ "بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے والے سنگدل، یہی لوگ اسلام جیسے آفاقی دین کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر ایسی حرکتیں کرنی ہیں تو خود کو مسلمان کے طور پر متعارف نہ کروائیں"۔

"دفع کریں ماما! کن کو سنا رہی ہیں"۔ عماد نے کہا۔ "وہ تو کب کے جا چکے ہیں۔ آئیں ہم آپ کو روف ٹاپ پر لے چلیں۔ آپ بہت اچھا محسوس کریں گی"۔

وہ مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن میرا موڈ بُری طرح خراب ہو چکا تھا۔ گوروں کی کم لباسی، عریانی اور سرِ عام بوس و کنار کی میں نے کبھی پروانہ کی تھی، لیکن آج اپنے ہم مذہبوں کی اخلاقی عریانی نے مجھے بے حد شرمسار اور دُکھی کر دیا تھا۔

مالمو سے الوداعی ملاقاتیں

بہتوں کو کہتے سنا کہ لاہور کا رہنے والا دنیا میں کہیں بھی جا کر خوش نہیں رہ سکتا۔ لاہور لوگوں کے اندر بس جاتا ہے اور نکالے نہیں نکلتا۔ لاہور میرے اندر بھی بس گیا ہے۔ جب کبھی شہر سے باہر گئی ہوں، نہر کنارے کھڑے درختوں اور انڈر پاسز پر لٹکتی بیلوں کے لہرانے کے انداز میں الوداعیت کا پیغام جھلکتا ہے اور واپس آنے پر وہی منظر خوش آمدید کہتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

لاہور میرے اندر بسا ہے اور مالمو نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔ گو کہ مجھے وہاں ہفتے کے پانچ دنوں تک دن کا بیشتر حصہ تنہا گزارنا ہوتا تھا۔ اس دوران نیچے کمپاؤنڈ میں جا بیٹھتی۔ آتے جاتے لوگوں کے ساتھ گونگی مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے رہتے۔ یا زیادہ۔ سے زیادہ سویڈش انداز کی ''ہئے ہئے'' کیونکہ من تر کی نمی دانم والا معاملہ تھا۔ صبح بچوں کے گھر سے نکلنے کے بعد بالکونی میں کھڑے ہو کر نہر کنارے پارک کی ہوئی گاڑی میں سوار ہوتے دیکھتی رہتی۔ وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی کو تھوڑا سا ریورس کر کے سڑک پر لاتے اور زن سے نکل جاتے۔ میں ان کی بخیریت واپسی کی دعا کرتے ہوئے اندر آ جاتی۔ ہر جمعہ کو یہ سوچ کر خوشی ہوتی کہ اگلے دو دن بچوں کے ساتھ رہوں گی۔

اپارٹمنٹس کے زیادہ تر رہائشی مقامی تھے۔ ہم لوگوں کے علاوہ ایک ایرانی خاندان تھا۔ میاں بیوی دونوں پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔ طٰہٰ کا ہم عمر بیٹا ''ماہن'' ان کی بڑھاپے کی اور اکلوتی اولاد تھا۔ عموماً طٰہٰ کے سکول سے آنے کے بعد آ دھمکتا۔ طٰہٰ جو سکول اور Fritid کو بھگتانے کے بعد بے حد تھکا ہوا ہوتا، بیزاری کا اظہار کرنے لگتا۔ ایک دفعہ

میں نے پیار سے طٰہٰ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو بیٹا! آپ کے پاس تو رجاء جیسی پیاری سی بہن ہے اور ماہن بے چارہ اکیلا ہے، اس کے بھائی بہن نہیں ہیں تو آپ اس کو تھوڑا اس ٹائم دیا کریں"۔

صاحبزادے نے کورا جواب دیا۔ "This is not my fault". He should ask to his parents (اس میں میرا کوئی قصور نہیں، وہ اپنے ماں باپ سے کہے) کوئی بتائے کہ ہم بتلائیں کیا؟"

مالمو میں زندگی مصروف مگر پُرسکون ہے۔ کوئی شخص کتنی ہی جلدی میں کیوں نہ ہو اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ دھکم پیل کا کوئی تصور نہیں۔ گاڑیاں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے ہارن نہیں بجاتیں۔

تیسری دنیا میں جہاں زیادہ تعداد "ہیو ناٹس" (Have nots) کی ہے، ایک مستقل سا خوف لوگوں کے چہروں پر رقم ہوتا ہے کہ جو ان کے پاس ہے کہیں چھن نہ جائے اور جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، کہیں ختم نہ ہو جائے۔ اس خوف سے جنم لینے والے احساسِ عدم تحفظ نے مجموعی قومی کردار کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں بالخصوص سویڈن میں کوئی شخص ختم ہو جانے یا چھن جانے کے خوف میں مبتلا نظر نہیں آتا۔ ہر شخص میں ایک انوکھا سا یقین نظر آتا ہے کہ اپنی باری پر ضرور ملے گا اور اس انوکھے یقین نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔

صبح سات بجے تمام بازار، دکانیں، دفاتر، پارلر، سپا سنٹر، جمنازیم کھل جاتے اور زندگی اپنی تمام تر رونقوں اور ہنگامہ خیزی کے ساتھ رواں ہو جاتی۔ ٹرننگ ٹارسو کے علاوہ شہر میں کوئی سکائی سکریپر نہیں، لہٰذا ماحول بے حد فطری سا محسوس ہوتا۔

فجر کی نماز کے بعد بالکونی میں کھڑے ہو کر سحری سویر کا نظارہ کرنا بھی کیا خوب ہوتا تھا۔ ستمبر میں سویریں سرد ہوائیں چلی تھیں۔ بالکونی کی ونڈوز کے شیشے برف کی سلگیں بن جاتے۔ طلوع ہوتے سورج کی روشنی ملگجے اندھیرے پر غالب آنے لگتی۔

نکھرتے منظروں میں نہر کنارے ایستادہ درختوں پر سے پرندے رزق کی تلاش میں روانہ ہوتے اور صبح کی سیر کے شائقین اپنے کتوں کے ہمراہ چہل قدمی کو نکل آتے۔خود سے آگے جاتے کتے کو زنجیر سے قابو کرتی ہانپتی کانپتی مائی کو دیکھ کر میں اکثر سوچتی کہ مائی کتے کو سیر کرا رہی ہے یا کتا مائی کو؟

دو ماہ دبے پاؤں گزر گئے تھے اور اب آخری ہفتہ سرپٹ دوڑے جاتا تھا۔ وقتِ رخصت کی قربت میں صبح شام کے دلکش مناظر ستور تو ریا کی رونقیں اور شاپنگ مالز کی روشنیاں میری اندرونی کیفیت کا آئینہ ہوئے جاتے تھے۔ بے رنگ اور پھیکے۔ایسے دنوں میں ایک دن خیال آیا کہ کیوں نہ جانے سے پہلے عماد کو اس کی پسندیدہ ڈش نہاری بنا کر کھلائی جائے۔سٹی فوڈ (City Food) ایک پاکستانی کی ملکیت نیا کھلا ہوا سٹور تھا۔عماد کے ساتھ پہلے بھی وہاں جا چکی تھی۔سوچا کہ وہاں سے معلوم کروں، اگر بونگ مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔یوں تو مریم عام بیف کی نہاری بناتی تھی۔مگر بونگ کی نہاری کی کیا ہی بات ہے۔

سٹی فوڈ کا پاکستانی سیلز مین فریزر میں سے بچھڑے کی ٹانگ نکال لایا۔"آپ بتا دیں کہاں سے گوشت کاٹنا ہے"۔ بونگ کی نشاندہی کر کے کچھ مصالحے وغیرہ دیکھنے لگی۔ ایک ریک پر پیکٹ بند مکس مصالحے الگ تھلگ رکھے تھے۔

"یہ سیل کے لئے نہیں ہیں"۔دکان کے مالک نے مجھے ان کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا۔

"کیوں جی؟" مجھے تعجب سا ہوا"۔سیل کے لئے نہیں ہیں تو رکھے کیوں ہیں؟"

"فوڈ انسپکشن والے آئے تھے،انہوں نے یہ الگ کر دیئے، کیونکہ ان پر تین زبانوں میں اجزاء نہیں لکھے گئے۔یہاں کھانے کی ایسی کوئی چیز فروخت نہیں ہو سکتی جس کے پیکٹ پر کم از کم سویڈش، انگریزی اور عربی میں اجزا (Ingrediants) نہ لکھے ہوں"۔

شام کو سب نے چٹخارے لے کر نہاری کھائی، بلکہ بعد میں کھانے کے لئے فریز

کر کے بھی رکھ لی۔ مریم نے اگلی شام کا پروگرام اناؤنس کر دیا۔

"میں نے Atmosfar ریسٹورنٹ میں ٹیبل بک کرالی ہے۔ کل ہم وہاں ڈنر کریں گے۔ سویڈن کے روایتی ذائقوں کو چکھے بغیر آپ کیسے جاسکتی ہیں۔

Fersens Vag پر واقع Atmosfar ریسٹورنٹ کے باہر چھتریوں کے نیچے لگی میزیں بھی پُر تھیں۔ کاؤنٹر کے پیچھے رنگ برنگی بوتلوں والی بار کے سامنے کھڑی لڑکی نے مسکرا کر خوش آمدید کہا اور میز تک ہماری رہنمائی کی۔ ویٹرس نے مینیو کارڈ لا کر ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ سویڈش میں لکھے گئے مینیو کارڈ میری سمجھ سے بالاتر تھے۔

"ماما! آپ کیا لیں گی؟" مریم مینیو کارڈ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"میں تو ان ڈشز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی"۔ میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ "تم لوگ خود ہی کوئی فیصلہ کرلو"۔

مریم اور عماد نے آپس میں مشورہ کر کے آرڈر نوٹ کرا دیا جو سی فوڈ پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ہم کیا کھا سکتے تھے۔ ویٹرس نے نوزل والی شیشے کی بوتل سے تھوڑا تھوڑا سا زیتون کا تیل ہماری پلیٹوں میں ڈال دیا اور ایک باسکٹ میں ڈبل روٹی کے سلائس لا کر میز پر رکھ دیئے۔

"یہ ایکسٹرا ورجن اولیو آئل ہے۔ اس پر نمک کالی مرچ چھڑک کر بریڈ کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ ریسٹورنٹ کی طرف سے کمپلیمنٹری دیا جاتا ہے"۔ شکر ہے عماد نے خود ہی بتا دیا۔ ورنہ میں پوچھنے والی تھی کہ یہ کیا ہے اور کیسے کھایا جاتا ہے۔ سفید ریشمی پردوں اور سیاہ اور سفید فرنیچر سے سجا ہال ایک پُروقار جاذبیت لئے ہوئے تھا۔ سٹارٹر کے طور پر رکھے گئے آلو اور چقندر کے باریک اور خستہ تلے ہوئے قتلوں کو ٹونگتے ہوئے لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو کے ساتھ ساتھ ایک نامانوس مہک بھی رچی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

یہ الکوحل کی بو تھی۔ جو یہاں کی معاشرتی زندگی کا حصہ ہے۔ میں اس بو سے آشنا

نہ تھی، مگر یہاں تو یہ عالم ہے کہ

کون ہے جس نے مے نہیں چکھی
کون جھوٹی قسم اُٹھاتا ہے

ویٹرس نے مین کورس سرد کر دیا تھا۔ مختلف قسم کی چٹنیوں کے ساتھ پلیٹوں میں سجائے گئے سامن مچھلی کے قتلے تلے ہوئے جھینگے اور Crabs اتنے دلکش انداز میں سجائے گئے تھے کہ کھانے کے بجائے دیکھتے رہو۔ ویٹرس بی بی نے گلاسوں میں ہمارا آرڈر کردہ اورنج جوس ڈال دیا اور اتنی مہارت سے کہ آدھا گلاس سے ایک قطرہ زائد نہ تھا۔

مختلف چٹنیوں اور سرکے میں بھیگی سامن مچھلی کی ڈش عماد نے میری طرف بڑھائی۔

''ماما! یہ لیجیے، سویڈن کی خاص ڈش ہے''۔

''بہت مزیدار ہے''۔ میں نے کانٹے سے ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ کچی ہوتی ہے''۔

''ہائیں! پہلے کیوں نہیں بتایا، کچی مچھلی کھلا دی''۔

وہ سب ہنس دیئے۔ ''یہ بتائیں مزے کی ہے یا نہیں؟''

''مزے کی تو ہے''۔ میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر کوئی نہاری پانجا کھانے والا لاہوری بھول بھٹک کر یہاں آنکلے تو اتنے کھانے سے اس کی داڑھ بھی گیلی نہ ہوگی''۔

''جی ماما!'' مریم مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ایسے ریسٹورنٹس میں وہ لوگ آتے ہیں جو ذائقوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ''کھوتا رج'' لگانے کو عرب ریسٹورنٹ ہیں ناں۔ وہ ٹھہرے اپنی مہمان نوازی کی روایتوں کے امین، ایک سرونگ ہی اتنی بڑی بناتے ہیں کہ وہ لوگ آرام سے کھا سکیں''۔
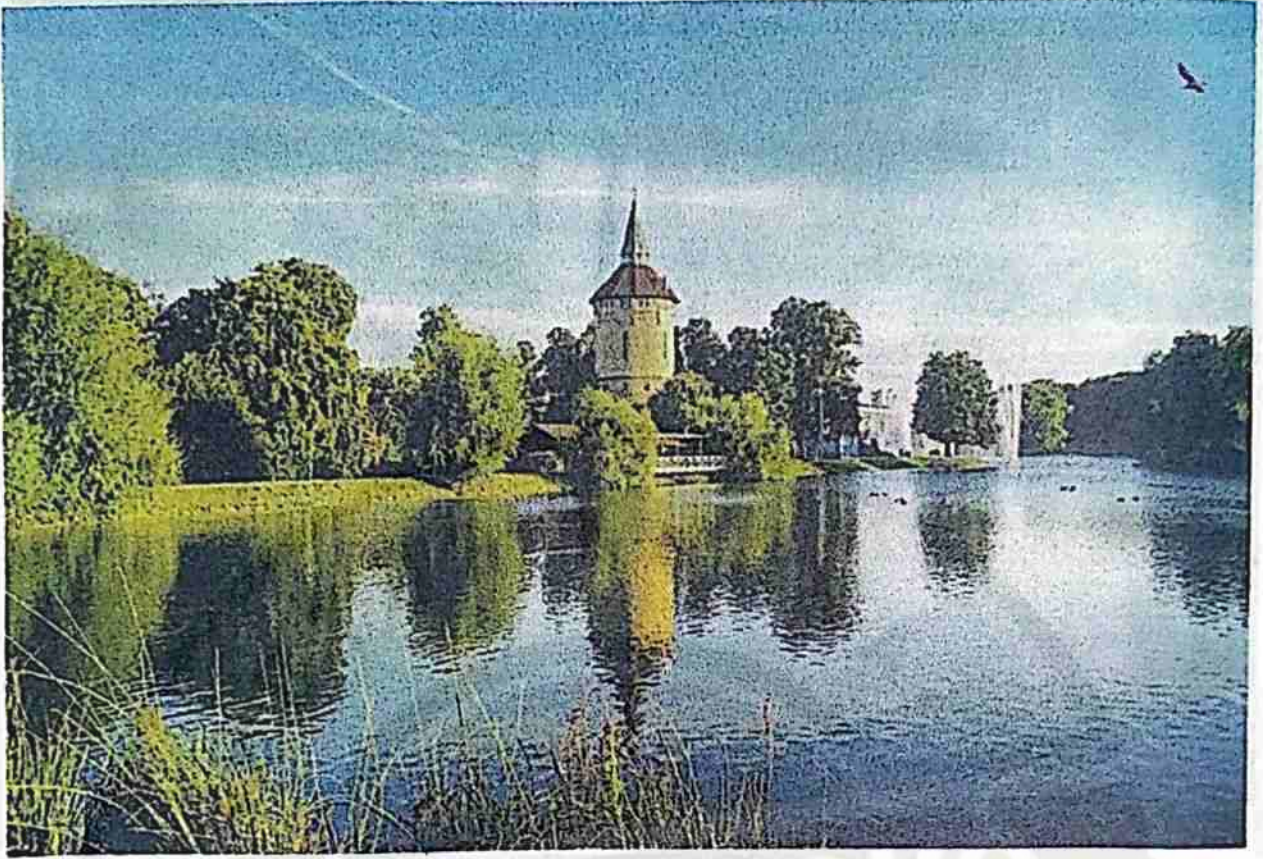
پلاٹیم پارک میں تلاریک اور

پلڈیم پارک میں عماد

پلڈیم پارک میں تلاریک اور جھیل (۱)

پلڈیم پارک میں الوداعی شام

روانگی سے ایک شام پہلے عماد مجھے بلڈیم پارک (Pildamm Park) دکھانے لے گیا۔ مریم میرا سامان پیک کرنے کے لئے گھر پر ہی رُک گئی تھی اور یہ آخری شام تھی جو ہم ماں بیٹا پلڈیم پارک میں گزارنے آئے تھے۔ اگلے دن مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔

پارک کے عین درمیان میں ایک سو ساٹھ میٹر قطر کا گول حصہ جو تلاریک (پلیٹ) کہلاتا ہے، دیو قامت درختوں سے گھرا تھا جن کو سامنے کی طرف سے انتہائی مہارت سے ہموار تراشا گیا ہے۔ گویا سبز دیواریں ہیں، جو آسمان کو چھوتی ہیں۔ تلاریک کے محیط میں کچھ نوعمر لڑکے لڑکیاں دوڑتے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ ان کی انسٹرکٹر ان کو ہدایات دیتی تھی۔ غالباً کسی ٹورنامنٹ کی تیاری ہو رہی تھی۔

پارک میں واقع جھیل کے شفاف نیلے پانی میں سرسبز درخت، خوش رنگ پرندے، نیلے آسمان پر اُڑتے دبیز سفید بادلوں کے ٹکڑے تصویر ہوئے جاتے تھے۔ پارک کے اس حصے کی خاموشی میں، جہاں ہم چلے جاتے تھے۔ روش پر پڑی بجری ہمارے قدموں کے نیچے چرچراتی تھی۔ یا آبی پرندوں کی آوازیں ماحول کو مرتعش کرتی تھیں۔

"عماد!" میں نے خاموشی کو توڑا۔ "اگر تم پہلے مجھے یہاں لے کر آتے تو اندر کی اداسی باہر کے منظروں پر غلبہ نہ پا لیتی"۔

"ہم م م!" وہ جانے کس سوچ میں گم تھا، محض ہنکارہ بھر کر رہ گیا۔

ہم لوگ چلتے چلتے مارگریٹا پویلین کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ پویلین کے درمیان پکی روش سامنے بنی بارہ دری تک جاتی تھی۔ روش کے دونوں طرف گھاس سبز قالینوں کی صورت بچھی تھی۔ جن کے متوازی بنی کیاریوں میں پھول گویا اُبلے پڑتے تھے۔ مارگریٹا پویلین کو پس منظر میں رکھتے ہوئے میں نے اپنے آئی فون سے عماد کی کئی

تصاویر لے ڈالیں۔

''یہ پویلین اس پارک کا سب سے قدیم حصہ ہے''۔ عماد نے بتایا۔ ''یہ جو جھیل ہے، یہ دراصل شہر کو پانی کی فراہمی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس کے پشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے درختوں کی باڑھیں لگا دی گئیں۔ 1914ء میں یہاں بالٹک صنعتی نمائش منعقد کی گئی۔ جس کے بعد ایک لینڈ سکیپ آرکیٹیکٹ نے پارک کا ڈیزائن بنایا۔ یہ بہت پُرسکون جگہ ہے۔ بلکہ اس کا پُرسکون ترین حصہ مراقبے کے لئے مخصوص ہے۔ آیئے میں آپ کو دکھاتا ہوں''۔

قد آدم تک بلند سرسبز باڑھوں میں گھرا یہ حصہ Galatheas Hoge ''گلاتھیس ہوگے'' کہلاتا ہے، جس کے درمیان میں چبوترے پر برہنہ عورت کا مجسمہ نصب تھا۔ میں نے عماد کی طرف دیکھا۔ وہ پھر سے سوچ کی وادیوں میں سرگرداں ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نظر بچا کر کنکھیوں سے مجسمے کا جائزہ لیا۔ آرٹسٹ نے کیا کمال کے متناسب اعضاء اور زہد شکن پیچ وخم بنائے تھے۔ یہاں مراقبہ کیا خاک ہوتا ہوگا۔ مراقبہ کرنے والے تو انہی پیچ وخم میں اُلجھ کر رہ جاتے ہوں گے۔

''اب واپس چلیں عماد؟'' میں نے سوچ میں ڈوبے عماد کا بازو ہلایا۔

''ماما!'' وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ، بابا اور صغریٰ زیادہ سے زیادہ وقت ہمارے ساتھ گزاریں؟''

''زندگی وہ نہیں ہے میرے بچے جو ہم چاہتے ہیں''۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''زندگی اس کی چاہت کے تابع ہے جس نے عطا کی ہے۔ اگر وہ کسی جھمیلے میں ڈال دے تو ہم چاہتے ہوئے بھی نہیں نکل سکتے۔

زندگی کے میلے میں، خواہشوں کے ریلے میں

تم سے کیا کہیں جاناں! کس قدر جھمیلے ہیں

''بس، آگے مجھے کہنے دیں''۔ عماد نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے روک دیا۔

وقت کی روانی ہے، بخت کی گرانی ہے
سخت بے زمینی ہے، سخت لامکانی ہے
ہجر کے سمندر میں تخت اور تختے کی
ایک ہی کہانی ہے، تم کو جو سنانی ہے
بات گو ذرا سی ہے، بات عمر بھر کی ہے
عمر بھر کی باتیں کب دو گھڑی میں ہوتی ہیں

اب گھر کو لوٹ چلیں

اگلے دن واپسی تھی۔ فلائٹ کا وقت رات نو بجے تھا۔ عماد اور مریم نے اپنے اپنے دفتر سے آدھے دن کی چھٹی لے لی تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ مریم اور بچوں کو گھر سے ہی خدا حافظ کہہ دیا جائے گا اور صرف عماد میرے ساتھ جائے گا اور ایئرپورٹ پر پارکنگ کی مشکلات سے بچنے کے لئے گاڑی کے بجائے ٹرین سے جائیں گے۔

ہم گھر سے گاڑی میں روانہ ہوئے۔ بچوں کو پیار کیا۔ مریم کو خدا حافظ کیا تو وہ دیر تک مجھ سے لپٹ کر کھڑی رہی۔ ہمیں ریلوے سٹیشن جا کر ٹکٹ خریدنا تھا اور پھر گاڑی عماد کے آفس کی پارکنگ میں کھڑی کر کے ٹرین سے کوپن ہیگن پہنچنا تھا۔ مگر قدرت کے منصوبے کچھ اور تھے۔ سٹیشن کے سامنے جہاں ہم نے گاڑی روک کر سامان اتارا وہاں دیر تک رُکنا منع تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم جلدی سے جا کر ٹکٹ لے لیں گے، پھر عماد گاڑی اپنے دفتر چھوڑنے چلا جائے گا، جو ریلوے سٹیشن کے قریب ہی تھا۔ مگر اندر جا کر معلوم ہوا کہ ٹرین نہیں جا رہی۔ عماد معلومات لینے استقبالیہ پر چلا گیا، جہاں اس کو بتایا گیا کہ ٹرین کے مسافر بس کے ذریعے کوپن ہیگن بھیجے جا رہے ہیں۔ عماد نے بس سے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اب

ہمیں اپنی گاڑی میں کوپن ہیگن جانا تھا۔اس سارے عمل میں دس منٹ صرف ہو گئے۔جونہی گاڑی میں بیٹھنے لگے،ایک پولیس والا بوتل کے جن کی طرح نمودار ہوا اور عماد کے ہاتھ میں پانچ سو کرونے جرمانے کا ٹکٹ تھما کر یہ جاوہ جا۔

''اللہ کرے بیڑہ غرق ہو ان کم بختوں کا۔خواہ مخواہ میں اتنا جرمانہ کر دیا میرے بچے کو''۔میں جو پہلے ہی رقیق ہو رہی تھی مخصوص مشرقی عورتوں کے انداز میں پولیس والے کو کوسنے لگی۔

''اوہو ماما! چھوڑیں بھول جائیں، یہاں ایسا ہی ہوتا ہے''۔عماد گاڑی ریلوے سٹیشن کی حدود سے نکال کر کھلی سڑک پر لاتے ہوئے بولا اور میرا دھیان بٹانے کو ایک واقعہ بیان کرنے لگا۔

''اس جنوری کی بات ہے، سخت برف باری ہو رہی تھی۔میونسپلٹی والے سڑک سے برف ہٹا کر کناروں پر لگا دیتے۔اس طرح پارکنگ کے لئے جگہ نہ بچ پاتی اور غلط پارکنگ کرنے پر پولیس والے جرمانے کی پیلی پرچی گاڑی پر چسپاں کر دیتے۔ایک ایسے ہی برفیلے دن میرے آفس کے سامنے ایک بڑے میاں پارکنگ کی جگہ بنانے کے لئے برف ہٹانے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوئے مالمو میونسپلٹی پر جی جان سے تبرا بھیج رہے تھے۔

''لعنت ہو ان میونسپلٹی والوں پر، دنیا کی گھٹیا ترین میونسپلٹی مالمو کی ہے۔پارکنگ کے لئے جگہ نہیں چھوڑتے اور اگر غلط پارک کر دو تو پیلے رنگ کی Shit لگا کر چلے جاتے ہیں''۔مجھے بابا جی پر بہت ترس آیا، میں نے برف ہٹا کر گاڑی پارک کرنے میں ان کی تھوڑی سی مدد کر دی تو بہت ممنون ہوئے اور میرا شانہ تھپتھپا کر دعا دیتے رہے''۔عماد میرا دھیان بٹانے میں کامیاب رہا تھا۔

گاڑی تیزی سے مالمو کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔یہ وہی سڑکیں

تھیں جن پر پچھلے دو ماہ آوارہ گردی کرتے رہے تھے۔ سب منظر دیکھے بھالے تھے، لیکن کچھ نیا بھی تھا۔

قریب سے گزرتی دو گاڑیوں میں گاتے بجاتے اور ہلا گلا کرتے نوجوان سوار تھے۔ سگنل پر دونوں گاڑیاں ہمارے برابر آ کر رُک گئی تھیں۔ میں نے اپنی متجسس طبیعت کے پیش نظر اچک کر ان گاڑیوں کے اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک دلہن براجمان تھی۔ سر تا پا سفید لباس میں ملبوس۔ جالی دار سفید کپڑے کی جھالریں اس کے شانوں پر بادلوں کی صورت سجی تھیں۔ گہری سرخ لپ سٹک نے اس کے ہونٹوں کی خوبصورت تراش کو واضح کر دیا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک تقدس اور نورانیت اس کا ہالہ کئے ہوئے تھی۔ وہ یہاں کے مادر پدر آزاد معاشرے کی فرد ہونے کے باوجود ایک شخص سے شریفانہ رشتہ جوڑنے جا رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی خوبصورتی کو سراہتے ہوئے مشرقی ماؤں کی طرح خوش اور آباد رہنے کی دعا دی۔

ہم مالمو کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب اوری سنڈ کا پُل گاڑی کے پہیوں کے نیچے پھسل رہا تھا۔ Lil grund wind farm کی ہوائی چکیاں سمندر میں مضبوطی سے قدم جمائے دیو قامت آہنی بازوؤں کو گھماتے ہوئے مالمو کو مسلسل توانائی فراہم کر رہی تھیں اوری سنڈ کے پُل کا نصف پار کرنے کے بعد سویڈن پیچھے رہ گیا تھا۔

"الوداع اے محنتی، انصاف پسند، دیانت دار اور صفائی پسند لوگو! شاید تم نے نصف ایمان کو پالیا۔ ایک آنچ کی کسر باقی ہے، کیا عجب کہ تمہاری تحقیق کی عادت تمہیں حق سے روشناس کرا دے۔

بے شک انسان کا دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے بیچ ہے۔ جانے کب سچائی کی طرف پھیر دے۔

اللہ کے دین کو کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ مجھے ہے۔ میرے ایمان کو ہے۔ میری عاقبت کو ہے۔ میں اپنے رب سے مدد کی طالب ہوں اور وہ عطا کرتا ہے مانگنے والوں کو۔

اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا اور اگر تمہارے ہاں ہو تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔ کچھ عجب نہیں کہ پندرہ صدیاں پہلے بادیہ نشیں جو پیغام صحراؤں سے لے کر چلے تھے وہ ان برف زاروں میں پہنچنے والا ہو"۔

شیشوں کے اُس پار پاکستان تھا

کوپن ہیگن ایئرپورٹ کی پارکنگ حسب توقع "ہاؤس فل" تھی۔ دو منزلہ پارکنگ ایریا کے دو تین چکر لگانے کے بعد آخر کار ایک بھلے آدمی کو اپنی کار کا دروازہ کھولتے دیکھ کر تاک میں کھڑے ہو گئے۔ جونہی اس شخص نے گاڑی ریورس کر کے باہر نکالی، عماد نے خالی جگہ پر اپنی گاڑی فٹ کر دی۔ چیک ان کاؤنٹر پر جا کر بورڈنگ پاس جاری کروایا۔ سامان کا وزن کیا گیا تو پورے تیس کلو نکلا۔ ایک کلو زیادہ نہ کم۔ میں مریم کی اندازہ کرنے کی صلاحیت کی قائل ہو گئی۔ جس نے مجھے کہا تھا فکر نہ کریں ماما! وزن تیس سے آدھا کلو بھی اُوپر نہیں جائے گا۔

عماد سکیورٹی چیک تک میرے ساتھ آیا۔ اس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے بازو ایک دوسرے کے گرد لپیٹ دیئے۔

"اللہ حافظ بیٹا! اللہ کی امان میں دیا"۔

"اللہ حافظ ماما! ان شاء اللہ دسمبر میں پاکستان کا چکر لگائیں گے"۔ عماد نے یہ کہتے ہوئے کچھ کرونے میرے پرس میں منتقل کر دیئے۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے بھلا ان کا کیا کرنا ہے"۔ میں نے یہ کہتے ہوئے پیسے اس کو واپس کرنا چاہے لیکن اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔

''رکھ لیں، کوئی ضرورت پیش آسکتی ہے''۔ اور مجھے نرمی سے سکیورٹی چیک کی قطار کی طرف دھکیل دیا۔ آہستہ آہستہ آگے سرکتی قطار میں باری آنے پر میں نے اپنا دستی سامان بیلٹ پر رکھا جو سکینر سے گزر کر دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے واک تھرو گیٹ سے گزر کر اپنا سامان اٹھالیا۔ کسی نے کوئی تعرض نہ کیا۔ میں جو ایک مہینے سے فلپائنی کی تلاشی کا منظر دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

فلائٹ میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ عماد نے اپنی محتاط طبیعت کے پیش نظر مجھے وقت سے کافی پہلے ایئرپورٹ پہنچا دیا تھا۔ ابھی میرا لاؤنج میں جا کر بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ نہ جانے کیوں ایئرپورٹ کا لاؤنج مجھے دنیا میں سب سے زیادہ اکتا دینے والی جگہ لگتا ہے۔ یہاں میرے سامنے وسیع ڈیوٹی فری شاپ پھیلی تھی اور یہ عجیب بات ہے کہ سکیورٹی چیک سے گزرتے وقت آپ کوئی چیز مائع حالت میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ حتیٰ کہ پرفیوم، لوشن، شیمپو غیرہ بھی نہیں۔ مگر ڈیوٹی فری شاپ سے جو مرضی الا بلا خرید کر جہاز میں لے جائیں۔ میں نے ڈیوٹی فری شاپ کا جائزہ لیا۔ مجھے بھلا کیا خریدنا تھا۔ ڈھیروں چاکلیٹ، کینڈیز اور کھلونے وغیرہ عماد اور مریم نے بچوں کے لئے خرید کر دیئے تھے۔ لوریل، الزبتھ آرڈن اور باڈی شاپ کے سٹال کاسمیٹکس اور سکن کیئر مصنوعات سے بھرے تھے اور پھر مجھے اپنی صلاحیت کا علم تھا کہ ایک دفعہ موائسچرائزنگ کریم خرید کر لائی تھی تو گھر آ کر فیس واش نکلا۔

آدھا گھنٹہ یہاں گزار کر گیٹ نمبر 33 کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ عماد کا کہنا تھا کہ مطلوبہ گیٹ تک پہنچنے میں تقریباً بیس پچیس منٹ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ تیر کے نشانوں کی رہنمائی میں گیٹ نمبر تینتیس کی جانب سفر شروع کیا۔ اس پندرہ منٹ کے بعد محسوس ہوا کہ اردگرد میں اردو پنجابی بولنے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ راستے میں امیگریشن کاؤنٹر سے پاسپورٹ پر ایگزٹ کی مہر لگوائی اور لاؤنج میں داخل ہوگئے۔ شیشوں

کے اُس پار پی آئی اے کا جہاز آہستہ آہستہ رُک گیا تھا۔

اسّی کی دہائی کے اواخر کی بات ہے جب اکثر پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان سفر کرنا پڑتا تھا۔ دہران انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے پی آئی اے کے جہاز میں قدم رکھتے ہی لگتا کہ گویا پاکستان پہنچ گئے۔ خوش اخلاق مستعد عملہ صاف ستھرا جہاز اور گرما گرم لذیذ کھانے چائے کافی وغیرہ...... یہ 1987ء کا پاکستان تھا۔

اور اب...... کیا کہا جائے؟ ذہین قارئین خود ہی سمجھ جائیں گے، شیشوں کے اس پار 2014ء کا پاکستان تھا۔